www.cpsglobal.org

الرسالہ

Al-Risala

November 2011 • No. 420

دوسروں کی شکایت صرف اپنی نااہلی کا اعلان ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

جاری کردہ 1976

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا

اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی

مولانا وحید الدین خاں

صدر اسلامی مرکز

Al-Risala Monthly

1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110 013
Tel. 2435 6666, 2435 5454
46521511, Fax: 45651771
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Subscription Rates
Single copy ₹10
One year ₹100
Two years ₹200
Three years ₹300
Abroad by Air Mail. One year $20

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

نومبر 2011

فہرست

الحبُّ للہ	2
انسان اور جنت	3
فقدانِ شعور	4
تجسیم کا نظریہ	5
عیادت کا رواج	6
اسلام اور عصرِ حاضر	7
عصری تقاضے — چند قابلِ غور پہلو	16
راستہ بند ہے	33
شکایت کے بجائے اصلاح	34
گھر آگے، میں پیچھے	35
سوال و جواب	36
خبر نامہ اسلامی مرکز — 213	41

الحبُّ للہ

انسان کے اندر سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ محبت کا جذبہ ہے۔ انسان جب کسی چیز کو اپنا سب سے بڑا کنسرن (supreme concern) بنائے تو اس کے بعد فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے محبت کے جذبات اس چیز سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں اِسی کو ''معبود بنانا'' کہا جاتا ہے۔ جس چیز سے آدمی سب سے زیادہ محبت کرے، وہی اس کا معبود ہے، خواہ وہ اس کے لیے محبت کا لفظ بولے یا نہ بولے۔

ایمان باللہ یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اِس طرح دریافت کرے کہ اللہ ہی سے اس کو سب سے زیادہ محبت ہوجائے۔ اِسی کو قرآن میں: الذین آمنوا أشد حباً لله (2: 165) کہا گیا ہے۔ جو آدمی اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرنے لگے، وہی وہ شخص ہے جس نے اللہ کو اپنا معبود بنایا۔

جس آدمی کے اندر اللہ کے لیے حقیقی محبت پیدا ہوجائے، اُس کے اندر سے یہ محبت مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے لگے گی۔ ظہور کی اِنھیں مختلف شکلوں کو قرآن میں حمد اور شکر اور ذکر جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ محبت ہی دراصل تعلق باللہ کی اصل ہے۔ اِس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ الحمد لله کا مطلب ہے: الحب للّٰہ۔ الشکر للّٰہ کا مطلب ہے: الحب للّٰہ۔ اِسی طرح اللہ کے لیے ذکر کثیر کا مطلب ہے: اللہ کے لیے محبتِ کثیر۔ قرآن میں آیا ہے کہ — اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے (13: 28)۔ اِس کا مطلب بھی یہی ہے کہ صرف اللہ کی محبت ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے انسان کو حقیقی معنوں میں اطمینانِ قلب عطا ہوتا ہے:

Love of God alone gives the peace of mind.

اللہ پر ایمان، اللہ کی دریافت (discovery) سے شروع ہوتا ہے۔ اِسی دریافت کو قرآن میں معرفت کہا گیا ہے۔ حقیقی معرفت وہ ہے جو آدمی کے پورے وجود میں شامل ہوجائے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اِسی سے وہ تمام اعلیٰ مظاہر پیدا ہوتے ہیں جن کو محبت اور شکر اور ذکر جیسے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انسان اور جنت

حدیث کی کتابوں میں ایک روایت اِن الفاظ میں آئی ہے: **لتدخلنَّ الجنَّةَ إلا مَن أبىٰ، وشرد على الله شِرادَ البعير** (فتح الباری 13/ 268) یعنی تم ضرور جنت میں داخل ہوگے، سوا اُس کے جس نے انکار کیا، اور وہ اللہ سے بھاگا جیسے اونٹ بدک کر بھاگتا ہے۔

اللہ نے انسان کو اصلاً جنت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اللہ کے تخلیقی منصوبے کے مطابق، انسان جیسی مکرم مخلوق کا مقام صرف جنت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اور جنت دونوں ایک دوسرے کا مثنّٰی (counter part) ہیں۔ انسان جنت کے لیے ہے، اور جنت انسان کے لیے۔

اللہ نے جنت میں داخلے کے لیے جو شرط مقرر کی ہے، وہ انتہائی حد تک قابلِ عمل ہے، وہ کسی بھی درجے میں انسان کے لیے ناقابلِ عمل نہیں۔ وہ شرط یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو جس فطری حالت پر پیدا کیا ہے، اُسی فطری حالت پر وہ جئے اور پھر اِسی فطری حالت کے ساتھ وہ اللہ تک پہنچ جائے (**إلا من أتى الله بقلبٍ سليم**)

جنت میں داخلے کی واحد شرط یہ ہے کہ آدمی خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت پر قائم ہو۔ وہ خدا کی فطرت سے انحراف نہ کرے۔ یہ خدائی فطرت ہر انسان کو الہام کر دی گئی ہے (91: 8)۔ اگر آدمی اپنے آپ کو ڈسٹریکشن (distraction) سے بچائے، تو وہ یقینی طور پر اپنی اِس فطرت کو پہچان لے گا۔

ہر انسان کے اندر ضمیر (conscience) موجود ہے۔ یہ ضمیر اِس خدائی فطرت کی ایک داخلی علامت ہے۔ خدا کے پیغمبر اِسی لیے آئے کہ وہ انسان کو اس فطرت سے باخبر کریں، تاکہ جو چیز لاشعور کی سطح پر انسان کے اندر موجود ہے، اس کو وہ شعور کی سطح پر دریافت کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جنت کے لیے ہے، اور جنت انسان کے لیے۔ اِس میں استثنا (exception) صرف اُس شخص کا ہے جو خود ہی اپنے آپ کو بھٹکا کر جنت کے سوا کسی اور منزل کا مسافر بن جائے۔

فقدانِ شعور

کشمیر کے ایک مسلم پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کشمیر کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ کشمیر میں ہندستانی فوج کی ہیبت ناک موجودگی کشمیر میں کسی تعمیری کام کے آغاز کے لئے مستقل رکاوٹ کی حیثیت رکھتی ہے:

The awesome presence of the Indian army is a permanent obstacle to any constructive work in Kashmir.

میں نے کہا کہ کشمیر کا اصل مسئلہ وہاں ہندستانی فوج کی موجودگی نہیں، بلکہ کشمیر کا اصل مسئلہ خود کشمیریوں کے اندر اسلامی شعور کی غیر موجودگی ہے۔ کشمیر کے لیڈروں نے کبھی کشمیریوں کے اندر اسلامی شعور پیدا نہیں کیا، انھوں نے صرف جذباتی تقریریں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیری مسلمان ایک بے شعور قوم بن کر رہ گئے۔

میں نے کہا کہ کشمیر کو جس مسئلے کا سامنا ہے، اس سے ہزاروں گنا زیادہ بڑا مسئلہ تیرھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آیا تھا۔ یہ تاتاریوں کا وحشیانہ حملہ تھا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ مسلم دنیا میں ہر طرف تاتاریوں کی سپر ہیبت ناک موجودگی (super awesome presence) دکھائی دینے لگی۔

مگر اس وقت مسلمانوں میں اسلامی شعور زندہ تھا۔ انھوں نے تاتاریوں کو حملہ آور کے بجائے مدعو کا درجہ دے دیا۔ وہ بڑے پیمانے پر تاتاریوں کے درمیان اسلامی دعوت کا کام کرنے لگے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم بظاہر اسلام کی دشمن تھی، وہ اسلام کی خادم بن گئی۔ یہ اسلامی شعور کا معجزہ تھا جو بدقسمتی سے کشمیر کے مسلمانوں کے اندر موجود نہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلے کا سبب کہیں اور ہوتا ہے اور آدمی اُس کے حل کے لیے کسی اور جگہ محنت کرنے لگتا ہے۔ جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے تو پہلا کام یہ ہے کہ بے لاگ جائزہ کے ذریعہ یہ دریافت کیا جائے کہ اِس مسئلے کا اصل سبب کہاں ہے۔ اصل سبب پر محنت کرنے سے مسئلہ حل ہوتا ہے، اور کسی دوسری چیز پر محنت کرنے سے نتیجۃً جو چیز ملتی ہے، وہ مسئلے میں اضافہ ہے، نہ کہ مسئلے کا حل۔

تجسیم کا نظریہ

بعض مذہبوں میں تجسیم (incarnation) کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ اِس کو حلول یا وحدتِ وجود بھی کہتے ہیں۔ حلول یا تجسیم کو اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **تجسُّد الإلٰہ فی شکل بشری (العلمانیۃ: نشأتها وتطورها وآثارها فی الحیاۃ الإسلامیۃ المعاصرۃ، لسفر بن عبد الرحمن الحوالی)** یعنی خدا کا انسانی صورت میں مجسم ہونا۔

حلول یا تجسیم کا یہ تصور اصلاً ایک فلسفیانہ تصور ہے۔ قدیم فلاسفہ مانتے تھے کہ اِس کائنات کا ایک خدا ہے، لیکن وہ خدا ایک قسم کی اسپرٹ ہے، اس کی کوئی شکل وصورت نہیں۔ یہ خدا جب ظاہر ہونا چاہتا ہے تو وہ کسی انسان کی صورت میں مجسم ہوجاتا ہے۔ ہندو مذہب میں اِسی کو 'اوتارواد' کہا جاتا ہے۔ اِس تصور کے مطابق، خدا اصلاً ایک غیر شخصی خدا (impersonal god) ہے، پھر وہ مختلف زمانوں میں کسی انسان کی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔ اِسی کو ہندو مذہب میں 'اوتار' کہا جاتا ہے۔

اسلام میں حلول یا تجسیم کا یہ نظریہ سرتاسر باطل ہے۔ کچھ صوفیا نے اس باطل تصور کو وحدتِ وجود (monism) کے نام پر اسلام میں داخل کیا، لیکن یہ یقینی طور پر ایک بے بنیاد نظریہ ہے، اسلام میں ایسے کسی نظریے کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ: **واسجد واقترب** (96:19) یعنی سجدہ کرو اور قریب ہوجاؤ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خدا اور بندے کے درمیان قربت کا واقعہ پیش آتا ہے، یعنی بندہ اور خدا دونوں ایک نہیں ہوجاتے، بلکہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ ایک بندہ جب حقیقی معنوں میں ساجد بن جاتا ہے تو وہ نفسیات کی سطح پر خدا کے قرب کا تجربہ کرتا ہے۔ خدا کے ساتھ اس کی سرگوشیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کو خدا کی موجودگی (presence of God) کا شدید تجربہ ہوتا ہے۔ حدیث کے الفاظ میں، وہ اس طرح عبادت کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ خدا کو دیکھ رہا ہے — خدا اور بندے کے درمیان وحدت کا تصور نہیں، البتہ اسلام میں، خدا اور بندے کے درمیان قربت کا تصور اپنے کامل ترین معنوں میں پایا جاتا ہے۔

عیادت کا رواج

آج کل یہ رواج ہے کہ کوئی بیمار ہو تو اس کو دیکھنے کے لیے اس کے دوست اور رشتہ دار ہجوم کرکے اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں صرف قریبی لوگ عیادت کے لیے آیا کرتے تھے۔ اب کمیونکیشن کی بنا پر لوگ دور دور کے مقامات سے چل کر عیادت کے لیے آتے ہیں اور اس کو اسلام کا جز سمجھتے ہیں۔ مگر یہ صرف ایک رواج ہے، اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

مریض کی عیادت حقیقۃً خیر خواہی کا نام ہے، اور خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی جہاں ہے، وہیں رہتے ہوئے وہ مریض کے لیے اللہ سے دعا کرے۔ دعا بلاشبہہ سب سے بڑی خیر خواہی ہے۔

ہجوم کرکے مریض کے پاس پہنچنا صرف مریض کے مسائل میں اضافہ کرتا ہے۔ اِس قسم کی عیادت کسی بھی درجے میں مریض کے لیے راحت کا سبب نہیں بنتی۔ مریض کی خدمت صرف دو طرح کے لوگ کر سکتے ہیں — گھر والے، یا ڈاکٹر۔

باہر کے جو لوگ مریض کی عیادت کے لیے آتے ہیں، وہ صرف مریض کے مسائل میں اضافہ کرتے ہیں۔ اِس قسم کی رواجی عیادت مریض کی خدمت نہیں ہے، بلکہ وہ مریض کے لیے صرف زحمت ہے۔ ایک ہے عیادت برائے مقصد۔ دوسرا ہے عیادت برائے عیادت۔ اگر واقعۃً مقصد کا تقاضا ہو تو ایسی عیادت ایک مطلوب کام قرار پائے گی۔ لیکن اگر عیادت برائے عیادت ہو تو اس کا کوئی فائدہ نہ دین کے اعتبار سے ہے، اور نہ دنیا کے اعتبار سے۔

حقیقت یہ ہے کہ مریض اگر خود کسی کو بلائے تو وہ سفر کرکے اس کے پاس آ سکتا ہے، لیکن مریض نے اگر اُس کو بلایا نہ ہو تو عیادت کے نام پر سفر کرکے دور دور کے مقام سے اس کے یہاں پہنچنا، بلاشبہہ ایک غیر مطلوب کام ہے۔ نہ شرعی اعتبار سے اس کا کوئی اجر ہے اور نہ دنیوی اعتبار سے اس کا کوئی فائدہ۔ یہ صرف پیسے اور وقت کا ضیاع ہے، اِس کے سوا اور کچھ نہیں — عیادت بطور ضرورت عیادت ہے، اور ضرورت کے بغیر عیادت صرف ایک بے روح رسم۔ (5 ستمبر 2011)

عصری تقاضے — چند قابلِ غور پہلو

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **إنّ اللہ یبعث لھذہ الأمّة علیٰ رأس کلّ مائة سَنة، مَن یجدّد لھا دینھا (سنن أبی داؤد، کتاب الملاحم، باب ما یُذکر في قرن المائة)** یعنی اللہ اِس امت کے لیے ہر سو سال کے سرے پر ایک شخص کو اٹھائے گا جو اُس کے لیے اُس کے دین کی تجدید کرے گا۔

یہ کوئی پُراسرار بات نہیں۔ یہ فطری قانون کے تحت پیش آنے والا ایک معاملہ ہے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی عمر بہت محدود ہے۔ وہ سو سال سے پہلے ہی مرجاتا ہے۔ اِس طرح ہمیشہ ایک کے بعد دوسری نسل آتی رہتی ہے۔ ایک تیار شدہ نسل ختم ہوجاتی ہے، اس کے بعد ایک غیر تیار شدہ نسل پیدا ہوکر اس کی جگہ لے لیتی ہے اور ضرورت ہوتی ہے کہ جس طرح پہلی نسل کو تیار کیا گیا تھا، اُسی طرح دوبارہ اگلی نسلوں کو تیار کیا جائے۔ زوال کا مذکورہ عمل ایک مسلسل عمل ہے، اور اِسی کو انحطاط (degeneration) کہا جاتا ہے۔ تجدید اِسی صورتِ حال کی اصلاح کا نام ہے۔

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس فطری پراسس کے معاملے میں امتِ محمدی کا کوئی استثنا نہیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت پر جب زوال کا دور آیا، تو بار بار مجددینِ اسلام پیدا ہوتے رہے۔ مثلاً عمر بن عبد العزیز اُموی (وفات: 720ء)، ابن تیمیہ الحرّانی (وفات: 1328ء)، شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات: 1762ء)، وغیرہ۔ یہ لوگ مسلّمہ طور پر مجدد تھے، اور انھوں نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تجدید کا کام کیا۔

دو دور

امتِ مسلمہ کے ثابت شدہ طور پر دو دور ہیں — روایتی دور (traditional period)، اور سائنسی دور (scientific period)۔ تاریخی ترتیب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلی صدیوں میں جو مجددینِ اسلام پیدا ہوئے، وہ سب روایتی دور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے روایتی ڈھانچے میں دین کو

ازسرِ نو منقّح کر کے پیش کیا۔ اب امتِ مسلمہ سائنسی دور میں پہنچ چکی ہے۔ اِس دور کے حالات مکمل طور پر پچھلے دور سے مختلف ہیں۔ اِس فرق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک مسلم اسکالر نے کہا تھا کہ:

Quran has to be re-revealed today.

مگر اصل یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ — ضرورت ہے کہ آج قرآن کی دوبارہ توضیح کی جائے:

Quran has to be re-defined today.

تجدید دین دراصل اِسی توضیح ثانی (re-defination) کا نام ہے۔ مجدد وہ ہے جو بدلے ہوئے حالات کو سمجھے اور نئے حالات میں دین کو دوبارہ واضح کرے۔ یہ کام اپنی حقیقت کے اعتبار سے تجدید (revival) کا کام ہے۔ یہ اصلِ دین کا دوبارہ احیا ہے۔ اس کا کوئی تعلق اُس عمل سے نہیں جس کو موجودہ زمانے میں اصلاح (reformation) یا نظرِ ثانی (revision) کہا جاتا ہے۔

موجودہ سائنسی دور میں تجدید کا یہ کام پوری شدت کے ساتھ مطلوب ہو چکا ہے۔ اب جب کہ سائنسی تحقیقات کے مطابق، سائنس داں یہ اعلان کر رہے ہیں کہ انسانی تاریخ اپنے خاتمہ (end) پر پہنچنے والی ہے۔ جس زِلزالِ شدید (99:1) کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے، اس کے آثار عملاً شروع ہو چکے ہیں۔ یہاں تک کہ اب یہ کہا جانے لگا ہے کہ — قیامت اب زیادہ دور نہیں:

Doomsday is not far.

ایسی حالت میں اب آخری وقت آ گیا ہے کہ اس کو متعین کیا جائے کہ جدید دورِ سائنس کی نسبت سے تجدید واحیا کا جو کام مطلوب ہے، وہ کیا ہے۔ اور وہ کام کیا ہے جس کو جدید حالات کی نسبت سے تجدید واحیا کا کام کہا جائے گا۔ قرآن اور حدیث کے حوالے سے اِس کام کی نوعیت کو پوری طرح معلوم کیا جا سکتا ہے۔

آفاق اور انفس میں ظاہر ہونے والی نشانیاں

قرآن میں واضح طور پر یہ پیشین گوئی موجود ہے کہ بعد کے دور میں فطرت کی چھپی ہوئی نشانیاں (signs) ظاہر ہوں گی، اور یہ ضرورت ہوگی کہ اِن نشانیوں کی روشنی میں دینِ خداوندی کو ازسرِ نو

مدلّل کیا جائے۔ یہ ضرورت قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے:

عن قریب مستقبل میں ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، آفاق میں بھی اور انفس میں بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر یہ پوری طرح کھُل جائے گا کہ یہ (قرآن) حق ہے (41:53)۔

آفاق اور انفس میں جن نشانیوں کے ظہور کی پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ واضح طور پر موجودہ زمانے میں سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آچکی ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں بتایا گیا تھا کہ حضرت موسیٰ کے معاصر فرعون کا جسم خدا نے محفوظ کر دیا ہے، اور وہ بعد کے زمانے میں ظاہر ہوگا (10:92)۔ اِس آیت کے نزول کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک یہ واقعہ لوگوں کے لیے غیر معلوم رہا۔ انیسویں صدی کے آخر میں پہلی بار سائنسی ذرائع سے یہ ممکن ہوا کہ فرعون کے اِس جسم کو دریافت کیا جاسکے اور اس کی معاصر تاریخ کا تعین کیا جاسکے۔ اِس طرح کے بہت سے نئے حقائق ہیں، جو قرآن کی صداقت کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ دورِ جدید کے تجدیدی کام کا ایک حصہ ہے، یعنی اِن نئی دریافتوں کو قرآن کی صداقت کی حیثیت سے پیش کرنا۔

لسانِ قوم میں دعوت

قرآن کی سورہ ابراہیم میں پیغمبروں کے بارے میں بتایا گیا ہے: **وما أرسلنا مِن رسول إلّا بلسانه قومه** (14:4) یعنی خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھی آیا، وہ اپنی مخاطب قوم کی زبان میں کلام کرتا تھا۔

قرآن کی اِس آیت میں 'لسان' سے مراد صرف زبان (language) نہیں ہے، بلکہ اُس میں کلام کا اسلوب (idiom) بھی شامل ہے۔ مثلاً پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی زبان میں کلام کیا۔ یہ آپ کے لیے قوم کی زبان (لسانِ قوم) میں بولنا تھا۔ حضرت ابراہیم نے زمین اور آسمان کے ملکوت (6:76) سے استدلال کرتے ہوئے مدعو کے سامنے اپنے بات پیش کی۔ اور حضرت مسیح نے تمثیل (metaphor) کے انداز میں اپنی بات کہی۔ یہ دونوں اسلوب کی مثالیں ہیں، جو اپنے زمانے کے لحاظ سے استعمال کی گئیں۔

موجودہ زمانے میں دعوتی کلام وہ ہے جو وقت کی زبان میں ہو۔ وقت کی زبان کا ایک مطلب داعی کے اپنے علاقے کی زبان ہے۔ پھر یہ کہ موجودہ زمانہ گلوبلائزیشن کا زمانہ ہے۔ اِس لحاظ سے ضروری ہے کہ داعی آج کی انٹرنیشنل زبان میں کلام کرے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، آج کی انٹرنیشنل زبان صرف ایک ہے، اور وہ انگریزی زبان ہے۔

''لسان'' کے مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ معاصر مخاطبین کے اسلوب میں ہو۔ آج کا اسٹینڈرڈ اسلوب وہ ہے جس کو سائنٹفک اسلوب کہا جاتا ہے۔ اگر آج کے انسان کو مخاطب کرنا ہے تو ضروری ہے کہ داعی کا کلام وقت کے اسلوب میں ہو، ورنہ یہ حال ہوگا کہ داعی بظاہر بولے گا، لیکن مدعو کا مائنڈ اس سے ایڈریس نہیں ہوگا۔ ایسے کلام کو دعوتی کلام نہیں کہا جاسکتا۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے اور قدیم روایتی اسلوب کیا تھا۔ قدیم روایتی اسلوب وہ تھا جس میں شعر، ادب، خطابت، رومانیت، تمثیل اور مبالغہ آرائی کی زبان میں کسی بات کے کہنے کو بھی کہنا سمجھا جاتا تھا۔ جذباتی طور پر پُرکشش الفاظ بولنے والے لوگ بھی داد کے مستحق قرار پاتے تھے۔ موجودہ زمانے میں اِس قسم کا اسلوب پوری طرح متروک ہو چکا ہے۔

موجودہ زمانے کا اسٹینڈرڈ اسلوب سائنٹفک اسلوب ہے۔ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو مبنی بر حقیقت اسلوب ہو۔ جس کے الفاظ اور معنی میں کامل مطابقت پائی جائے۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ سائنٹفک اسلوب وہ ہے جو پورے معنوں میں علمی اور منطقی (rational) اسلوب ہو۔ موجودہ زمانے میں وہی لٹریچر دعوتی لٹریچر ہے جو اِس سائنٹفک اسلوب میں لکھا گیا ہو — یہی سائنٹفک اسلوب قرآن کا اسلوب ہے۔

تعلقاتِ انسانی کا اصول

انسانوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے کے لیے ہمیشہ ایک جامع اصول درکار ہوتا ہے۔ ایک ایسا اصول جو اپنے اور غیر کے درمیان مساوات (equation) کے قیام کی بنیاد بن سکے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی سماج کو منظّم کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

اسلام کی تاریخ میں ابتدائی اور معیاری زمانہ وہ ہے جس کو عہدِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اِس زمانے میں انسانی تعلقات کی بنیاد جس اصول پر قائم کی گئی تھی، وہ شاہد اور مشہود (3 :85) کی بنیاد تھی۔ یہ دونوں لفظ شہادت (گواہی) سے اخذ کئے گئے ہیں۔ شاہد کا مطلب ہے گواہ (witness)، اور مشہود کا مطلب ہے وہ جس پر گواہی دی جائے (witnessed)۔ شہادت سے مراد دعوت ہے اور شاہد اور مشہود سے مراد وہی چیز ہے جس کے لیے داعی اور مدعو کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

مسلمان اور دوسری قوموں کے درمیان شاہد اور مشہود کی یہ مساوات (equation) عہدِ رسالت اور عہدِ صحابہ میں قائم رہی۔ اِس کے بعد عباسی سلطنت کا زمانہ آیا، جب کہ دنیا کے بڑے حصے میں ایک مسلم ایمپائر قائم ہوگیا۔ اب شاہد اور مشہود کی یہ سابق مساوات ٹوٹ گئی اور نئی مساوات، حاکم اور محکوم کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے، جب کہ مسلم فقہاء نے دارالکفر اور دارالاسلام کی اصطلاحیں وضع کیں۔ اِس مساوات کے تحت، دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ مسلم اکثریت کے علاقے دارالسلام بن گئے۔ اور اس کے مقابلے میں غیر مسلم علاقے دارالکفر قرار پائے۔

انیسویں صدی عیسوی میں یورپ کی نوآبادیاتی طاقتوں (colonial powers) کے ظہور کے بعد یہ مساوات (equation) دوبارہ ٹوٹ گئی۔ اب مغربی تہذیب کے غلبہ کے تحت، دنیا میں جمہوریت (democracy) کا زمانہ آیا۔ سیاست کے جمہوری تصور کے تحت، حاکم اور محکوم کی مساوات بے معنیٰ قرار پائی۔ اُس نے اپنے حق میں فکری اساس کھودی۔

مسلمانوں اور مغربی قوموں کے درمیان بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگیں (crusades) پیش آئیں۔ اِن جنگوں میں مغربی قوموں کو شکست ہوئی، لیکن اِس شکست نے مغربی قوموں کے اندر ایک مثبت نتیجہ پیدا کیا۔ یہ لوگ علم کے میدان میں سرگرم ہوگئے، یہاں تک کہ مغربی یورپ میں پندرھویں اور سولھویں صدی میں وہ واقعہ پیش آیا جس کو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کہا جاتا ہے۔

اِس کے بعد مغربی دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مغربی قوموں نے تجارت اور صنعت کے

نئے طریقے دریافت کیے، یہاں تک کہ عمومی پیمانے پر ایک نئی مساوات (equation) قائم ہوگئی۔ یہ تاجر اور خریدار (trader and costomer) کی مساوات تھی۔ اِس مساوات کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے ایک نیا کلچر وجود میں آیا جو خریدار دوست کلچر (customer-friendly culture) کے اصول پر مبنی تھا۔ یہی کلچر آج کی دنیا میں ابھی تک باقی ہے۔

اِس نازک وقت میں مسلمانوں کے ساتھ ایک المیہ (tragedy) پیش آیا۔ مسلمان حاکم اور محکوم کی سابقہ سوچ سے باہر نہ آسکے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جدید اقتصادیات کی مین اسٹریم میں شامل نہ ہوسکے۔ اِس پچھڑے پن کی قیمت مسلمانوں کو یہ دینی پڑی کہ وہ موجودہ زمانے میں دہرا نقصان کا شکار ہوگئے۔

جدید حالات سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر ایک طرف یہ ہوا کہ وہ اقتصادیات میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے۔ دوسرا اِس سے بھی بڑا نقصان یہ تھا کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈبل اسٹینڈرڈ (double standard) کا کیس بن گئے۔ ذہنی طور پر وہ دوسری قوموں کے بارے میں منفی خیالات رکھتے تھے، لیکن ان کا یہ منفی فکر قابلِ عمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اپنی مادّی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے اُن کو اِنھیں قوموں سے مل کر کام کرنا تھا۔ داخلی طور پر وہ اِن قوموں کے بارے میں منفی ذہن رکھتے ہوئے، خارجی زندگی میں اُنھیں ان قوموں کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑا۔

اِس طرح مسلم تاریخ میں پہلی بار ایک سنگین بُرائی پیدا ہوئی، یعنی داخلی طور پر منفی رائے رکھتے ہوئے، خارجی معاملات میں دوسروں کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اپنی مادّی زندگی کی تعمیر کرنا۔ یہ دوعملی یا ڈبل اسٹینڈرڈ کی عمومی حالت تھی۔ اِس قسم کی عمومی دوعملی مسلمانوں کی تاریخ میں اِس سے پہلے کبھی پیش نہیں آئی۔

اِس برائی سے بچنے کا واحد طریقہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے دورِ اوّل کی طرف فکری واپسی، یعنی دورِ اول کی طرح دوبارہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کی مساوات (equation) قائم کرنا۔ داعی اور مدعو کی مساوات ہی اسلام کے مطابق، صحیح مساوات ہے۔ اِس مساوات کو دوبارہ قائم کرکے مسلمان موجودہ دوعملی کی بُرائی سے بچ سکتے ہیں اور اِسی کے ساتھ امتِ مسلمہ ہونے کی حیثیت سے

وہ اپنی عمومی ذمے داری کو ادا رسکتے ہیں، یعنی دعوت الی اللہ کی ذمے داری۔

آئڈیالوجی آف دعوہ

حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت عملاً زندہ نہ رہے اور پھر کوئی شخص اس کو اپنی کوششوں سے زندہ کرے، تو اِس عمل پر اس کے لیے بہت بڑا اجر ہے: **من أحيا سنة من سنتي قد أميتت بعدي فإن له من الأجر مثل من عمل بها۔** (**الترمذي، رقم الحديث**: 2677)

اِس حدیث کو سامنے رکھا جائے اور غور کیا جائے کہ موجودہ زمانے میں وہ کون سی سنت رسول ہے جو آج زندہ نہیں ہے تو بلاشبہہ وہ صرف ایک سنت ہوگی، اور وہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو دیکھئے تو ان کے درمیان نماز اور روزہ اور حج اور زکاۃ جیسے دینی اعمال بہت بڑے پیمانے پر انجام دیے جارہے ہیں، لیکن صرف ایک ہی بڑی سنت ہے جو آج عملاً زندہ نہیں، اور وہ دعوت الی اللہ کی سنت ہے۔ اِس معاملے میں مسلمانوں کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ وہ ملّی خدمت یا اصلاح المسلمین کا کام کریں گے اور وہ اس کو دعوت الی اللہ کا نام دے دیں گے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کے رشتے کو زندہ کرنا، اِس معاملے میں سنتِ رسول کو زندہ کرنا ہے۔ لیکن یہ کوئی سادہ کام نہیں۔ یہ بلاشبہہ ایک عظیم ترین کام ہے۔ دعوت کی اِسی اہمیت کی بنا پر قرآن میں اُس کو جہادِ کبیر (25:52) کہا گیا ہے۔

مسلمانوں کے درمیان دعوت الی اللہ کی سنت کو حقیقی معنوں میں زندہ کرنے کے لیے ایک مکمل دعوہ آئڈیالوجی (ideology of dawah) درکار ہے، ایک ایسی آئڈیالوجی جو دعوت کی اہمیت کو جدید علمی اصول پر مدلّل کرے، جو اُن سوالات کا تشفی بخش جواب دے جو دعوت کے راستے میں ذہنی رکاوٹ (intellectual obstacle) کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دعوت کا کام ایک ایسے ماحول کا طالب ہے، جہاں داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور تشدد کا مکمل خاتمہ کر دیا گیا ہو۔ واضح رہے کہ یہ خاتمہ فریقِ ثانی کی طرف سے کبھی نہیں کیا جائے گا۔ یہ خاتمہ

جب بھی ہوگا، وہ داعی گروہ کی طرف سے یک طرفہ طور پر کیا جائے گا، اِسی لیے قرآن میں دعوت کا حکم دیتے ہوئے پیغمبر اسلام سے فرمایا گیا: ولربّك فاصبر (74:3) یعنی مدعو کی طرف سے تمام زیادتیوں پر یک طرفہ صبر کرو اور پوری طرح مثبت انداز میں دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھو۔

جدید نظریات

موجودہ زمانے میں بہت سے ایسے نظریات سامنے آئے ہیں جو بظاہر اسلام کے روایتی موقف سے ٹکراتے ہیں۔ اِس ظاہری ٹکراؤ نے موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو اِن جدید نظریات کے بارے میں منفی ذہن میں مبتلا کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ اِن نظریات کی ایسی توضیح کی جائے جو اس معاملے میں مسلمانوں کے منفی ذہن کا خاتمہ کر سکے۔ بصورتِ دیگر، داعی اور مدعو کے درمیان وہ نارمل تعلقات قائم نہیں ہوں گے جو دعوت کے مثبت عمل کے لیے ضروری ہیں۔

مثلاً موجودہ زمانے میں شتمِ رسول کا مسئلہ مسلمانوں کے لیے ایک حساس مسئلہ بن گیا ہے۔ مسلمان جب بھی کوئی ایسی تحریر پڑھتے ہیں یا تقریر سنتے ہیں، جو اُن کے نزدیک شتمِ رسول کے ہم معنیٰ ہو، تو وہ فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور تشدد کا عمل شروع کر دیتے ہیں۔ یہ صورتِ حال نہایت سنگین طور پر دعوتی عمل کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

اِس کا سبب یہ ہے کہ جدید تہذیب کے زیر اثر آج تمام غیر مسلم قوموں میں یہ مان لیا گیا ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی مطلق معنوں میں انسان کا ایک حق ہے، کسی بھی عذر کی بنا پر اس کو ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے ماحول میں مسلمان جب بطورِ خود شتم کے واقعے کو لے کر ہنگامہ شروع کرتے ہیں اور وہ میڈیا کے ذریعے فوراً لوگوں کے علم میں آجاتا ہے، تو لوگ یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ اسلام آزادئ رائے کے خلاف ہے۔ اِس بنا پر اسلام اِس قابل نہیں کہ وہ جدید انسان کا مذہب بن سکے۔

میں ذاتی طور پر شتمِ رسول کو ایک ایسا معاملہ سمجھتا ہوں جس پر مسلمان صرف دو قسم کے رویّے کا حق رکھتے ہیں۔ یا تو وہ اس سے اعراض کرتے ہوئے خاموش رہیں، یا دلیل کی زبان میں پُر امن طور پر وہ اس کا جواب دیں۔ اِس موضوع پر میں نے ''شتمِ رسول'' کا مسئلہ کے نام سے ایک مستقل کتاب

لکھی ہے جو 191 صفحات پر مشتمل ہے اور 1997 میں نئی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔

تاہم بالفرض اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہو کہ شتمِ رسول ایک قابلِ گردن زدنی معاملہ ہے، اور شتم کا کیس یُقتل حدًّا کا کیس ہے، تب بھی اس کو اِس معاملے میں اجتہاد کرنا چاہیے۔ دعوت الی اللہ کی مصلحت کا تقاضا ہے کہ ایسا شخص اِس معاملے کو الضّرورات تبیح المحظورات کے خانے میں ڈالے، اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت، اس کو موجودہ زمانے میں ساقط قرار دے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں مسلمانوں کا منفی ذہن بدستور باقی رہے گا اور وہ دعوت جیسے مثبت عمل کے لیے نااہل (incompetent) قرار پائیں گے۔

اوپر جن مسائل کا بیان ہوا، وہ براہِ راست طور پر دعوت الی اللہ کی تجدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں، ان کے ریفرنس میں دعوت کی اہمیت کو دوبارہ دریافت کرنا ہے۔ نئے حالات میں جو نئے موانع (obstacles) پیدا ہوئے ہیں، ان کا اِس طرح جواب دینا ہے جو دعوت کے راستے کو دوبارہ کھولنے والا ہو۔ موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کی بات کرنا دراصل اِنھیں سوالات کو ایڈریس کرنے کا نام ہے۔ اِس سے کم تر درجے کا کوئی عمل موجودہ زمانے میں دعوت الی اللہ کے راستے کو ہموار کرنے والا نہیں۔

اِن مسائل سے صرفِ نظر کر کے اگر کوئی کام کیا جائے اور بطور خود اس کو دعوت الی اللہ کا نام دیا جائے، تو یہ قرآن کے الفاظ میں یحبّون أن یُحمدوا بما لم یفعلوا (3:188) کا مصداق ہوگا، یعنی ایک ایسے کام کا کریڈٹ لینا جس کو آدمی نے سرے سے انجام ہی نہیں دیا۔

بھوپال میں الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل پتے پر رابطہ کریں:

Zuberi Book House
Near Ibrahimpura Masjid
Ibrahimpur, Bhopal-462001
Mob. 09425689224, 09893575890, 09752654872

اسلام اور عصرِ حاضر

خالق کی طرف سے انسان کو جو نعمتیں دی گئی ہیں، ان میں سے ایک عظیم نعمت قرآن ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ اِس میں تمام باتوں کا بیان ہے (16: 89)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن ہمارے لیے معاملاتِ زندگی کو سمجھنے کے لیے ایک مستند کتاب حوالہ (book of reference) کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کے ذریعے ہم خالق کے تخلیقی پلان (creation plan) کو سمجھ سکتے ہیں، اور زندگی کی منصوبہ بندی کے لیے صحیح نقطۂ آغاز (starting point) کو پا سکتے ہیں۔ اِسی طرح دعوت الی اللہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے بھی قرآن ایک مستند کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قرآن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ حق کے دو دور ہیں۔ ایک ہے پیغمبروں کا زمانہ، اور دوسرا ہے بعد کو آنے والا زمانہ۔ پیغمبروں کے زمانے میں خدا نے آیاتِ وحی کے ذریعے حق کا اظہار فرمایا، اور اس کی مزید تائید کے لیے پیغمبروں کو معجزے دے، یعنی ایسی نشانیاں (signs) جن کا انکار کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہ ہو۔

بعد کے زمانے میں پیغمبروں کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا، لیکن دعوت کا عمل بدستور جاری رہا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے زمانے میں، آفاق اور انفس میں ایسی آیات ظاہر ہوں گی جو حق کی تبیین کرنے والی ہوں (41: 53)۔ اِس قرآنی وضاحت کے مطابق، تبیینِ حق کے دو دور ہیں۔ ایک ہے تبیین بذریعہ آیاتِ وحی، اور دوسری ہے تبیین بذریعہ آیاتِ فطرت۔

دعوت کے پہلے دور میں تبیینِ حق کا کام پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا۔ دعوت کے دوسرے دور میں، قرآن کے مطابق، تبیینِ حق کا کام آیاتِ فطرت کے ذریعے انجام پائے گا۔ دوسرے دور میں تبیینِ حق کی پیشگی خبر قرآن کی سورہ حم السجدہ کی مذکورہ آیت نمبر 53 میں دی گئی ہے۔ دورِ اوّل میں تبیینِ حق کا کام خدا کے پیغمبروں کے ذریعے انجام پایا، اور دورِ ثانی میں تبیینِ حق کا کام علماءِ اسلام کے ذریعے انجام پائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: **العلماء ورثة الانبياء** (**سنن أبي داؤد، كتاب العلم،**

باب الحث علی طلب العلم) یعنی امتِ محمدی کے علماء نبیوں کے وارث ہیں۔

دعوت کے پہلے دور میں تبیینِ حق کا کام جن پیغمبروں نے انجام دیا، انھوں نے اپنے کام کے ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں (إني رسول الله إليكم) ۔ اِس اعلان کا حق انھیں اِس لیے تھا کہ فرشتہ جبریل کے ذریعے اُنھیں براہِ راست طور پر یہ علم دیا گیا تھا۔ لیکن بعد کے دور میں جو عالم، یا علماء کا جو گروہ تبیین حق کے کام کو انجام دے، اس کو مذکورہ قسم کے پیغمبرانہ اعلان یا دعویٰ (claim) کے ساتھ اپنے کام کا آغاز کرنے کا حق نہیں۔

بعد کے زمانے میں تبیینِ حق کا کام کرنے والے علماء کی شناخت ان کے ذاتی اعلان کے ذریعے نہ ہوگی، بلکہ ان کے کام کے ذریعے ہوگی، یعنی جو علماء بعد کے دور میں ظاہر ہونے والی آیاتِ فطرت (signs of nature) کا گہرا علم حاصل کریں اور ان کو دعوتِ حق کی حمایت میں درست طور پر اور موثر طور پر استعمال کریں، وہ اِس آیت میں کی گئی پیشین گوئی کا مصداق ٹھیریں گے۔ ایسے علماء کو صرف ان کے کام کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے، نہ کہ ان کے اعلان کے ذریعے۔

ایک یادگار دن

29 فروری 1955 میری زندگی کا وہ دن تھا جس کو میں اپنے لیے ایک بریک تھرو (break through) سے تعبیر کرتا ہوں۔ اُس دن لکھنؤ کے امین الدولہ پارک میں جماعت اسلامی ہند کے زیر اہتمام ایک عمومی اجتماع ہوا۔ اِس موقع پر اسلام کے عقلی اثبات پر راقم الحروف کی ایک تقریر ہوئی۔ بعد کو جب اعلان کیا گیا کہ یہ تقریر چھپی ہوئی صورت میں یہاں بک اسٹال پر موجود ہے، تو لوگوں کا ہجوم اس کو لینے کے لیے بک اسٹال پر ٹوٹ پڑا۔ تقریر کے تمام مطبوعہ نسخے اُسی وقت فروخت ہو گئے۔ یہ تقریر پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا نام تھا ''نئے عہد کے دروازے پر''، ہندی میں ''نو یُگ کے پرویش دوار پر'' اور انگریزی میں:

On the Threshold of A New Era

اِس تقریر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اسلام کی دعوت کو عصری اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی

گئی تھی۔ یہ میری زندگی میں ایک انقلابی واقعہ تھا۔ اِس واقعے نے میری آئندہ زندگی کا رخ متعین کردیا۔ اب میں نے شعوری طور پر یہ طے کرلیا کہ مجھے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر تیار کرنا ہے۔ اس کے بعد میں نے مذکورہ موضوع کا زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ شروع کردیا۔ اِس درمیان میں مقالہ یا پمفلٹ کی صورت میں بعض تحریریں شائع ہوئیں۔ مثلاً حقیقت کی تلاش‘‘۔ یہ مقالہ 6 ستمبر 1958 کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا گیا، اور اس کے بعد وہ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا۔

اِس موضوع پر میرے مطالعے کا ایک نتیجہ وہ تھا جو باقاعدہ کتاب کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یہ کتاب جو پہلی بار 1966 میں مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (ندوۃ العلماء، لکھنؤ) سے شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا اردو ٹائٹل ’’مذہب اور جدید چیلنج‘‘ تھا۔ بعد کو اِس کتاب کا عربی ترجمہ ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں نے کیا۔ یہ عربی ترجمہ پہلی بار 1969 میں کویت اور بیروت اور قاہرہ سے ’’**الاسلام یتحدّی**‘‘ کے نام سے چھپا۔ اِس کتاب کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر فریدہ خانم نے کیا، جو پہلی بار 1985 میں گاڈ ارائزز (God Arises) کے نام سے شائع ہوا۔

مذہب اور جدید چیلنج 1964 میں لکھ کر تیار ہوئی۔ میں نے اس کا مسوّدہ (manuscript) مجلس تحقیقات ونشریاتِ اسلام (لکھنؤ) کے ذمے داروں کو برائے اشاعت دیا۔ چوں کہ اِس کتاب میں بہت زیادہ سائنسی حوالے تھے، مجلس کے ذمے داروں نے چاہا کہ اشاعت سے پہلے وہ کسی ایکسپرٹ (expert) سے اس کی تصدیق حاصل کرلیں۔ اِس مقصد کے لیے کتاب کے مسوّدے کو لکھنؤ کے ایک مسلم آئی اے ایس افسر کو دیا گیا۔ انھوں نے کتاب کے مسوّدے کو پڑھنے کے بعد مجلس کے نام ایک تحریر بھیجی۔ اِس تحریر میں کتاب کے بارے میں منفی رائے دیتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ایسی ایک کتاب لکھنے کے لیے مصنف کا کریڈنشیل (credential) کیا ہے۔

مذکورہ مسلم افسر کی یہ تحریر مجھے دی گئی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے تحریری صورت میں اس کا جواب دیا۔ میں نے اپنے جواب میں یہ لکھا کہ — اس کتاب کے مصنف کا کریڈنشیل یہ ہے کہ اِس موضوع پر پوری مسلم دنیا میں اب تک کوئی ایک کتاب بھی لکھی یا چھاپی نہیں گئی ہے۔ جدید تاریخ میں میں پہلا شخص ہوں

جس نے اسلام اور جدید علمی چیلنج کے موضوع پر باقاعدہ مطالعہ کیا اور اس پر ایک مکمل کتاب تیار کی۔ اگر آپ کے خیال کے مطابق، اِس موضوع پر کوئی دوسری کتاب پائی جاتی ہے، تو آپ مجھے اُس کا نام بتائیں۔ میرے اِس جواب کے بعد لوگ خاموش ہوگئے اور میری کتاب کو 1966 میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے شائع کر دیا گیا، جو اِس کتاب کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اِس کے بعد میری زندگی مختلف مراحل سے گزرتی رہی۔ یہاں تک کہ میں نے 1970 میں دہلی میں اسلامی مرکز کے نام سے ایک دعوتی ادارہ قائم کیا، اور 1976 میں 'الرسالہ' کے نام سے ایک دعوتی ماہ نامہ جاری کیا، جو اب تک پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے۔

اِس ادارہ (اسلامی مرکز) کے تحت، میں نے باقاعدہ طور پر کتابیں شائع کرنا شروع کیا۔ اِن کتابوں کا موضوع براہِ راست یا بالواسطہ طور پر صرف ایک ہوتا تھا، اور وہ ہے — جدید علمی چیلنج کے مقابلے میں اسلام کا مدلّل تعارف پیش کرنا۔ ماہ نامہ الرسالہ میں اِن کتابوں کا اشتہار جس عنوان کے تحت چھپتا تھا، وہ عنوان یہ تھا — عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جدید تہذیب کے ظہور اور پرنٹنگ پریس کے زمانے میں پوری مسلم دنیا میں مختلف زبانوں میں کثرت سے کتابیں چھاپی گئیں، لیکن میرے علم کے مطابق، اِن کتابوں کے تعارف کے لیے کسی نے بھی ''عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر'' کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اب بھی کوئی مسلم ادارہ ایسا نہیں ہے جو اپنی مطبوعات کے تعارف کے لیے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کا لفظ استعمال کرتا ہو۔ گویا کہ یہ ٹائٹل غیر متنازعہ طور پر صرف ہمارے مشن کے تحت شائع شدہ کتابوں پر منطبق ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا شخص یا ادارہ اِس معاملے میں، دعوے دار کے درجے میں بھی اس میں شریک نہیں۔

جدید تہذیب کی طرف سے جو فکری چیلنج پیدا ہوا، اس کا تعلق تمام مذاہب سے تھا۔ اِس صورتِ حال کے پیدا ہونے کے بعد دورِ جدید میں کچھ نمایاں افراد پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے عقیدہ یا اپنے مذہب کو ماڈرن معیار پر پیش کرنے کا کام کیا۔

مثال کے طور پر ڈاکٹر رادھا کرشنن (وفات: 1975) ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ وہ ہندوازم (Hinduism) پر گہرا عقیدہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ہندوازم کو جدید

معیار پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ اِس سلسلے میں ان کی دو کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. A Source Book in Indian Philosophy, 1957
2. Recovery of Faith, 1956

ڈاکٹر رادھا کرشنن موجودہ زمانے کے نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھے، تاہم یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے جس مقدمے کی پیروی کی، وہ مقدمہ اپنے آپ میں کم زور تھا۔ اور جو مقدمہ اپنے آپ میں کمزور ہو، کوئی بڑے سے بڑا وکیل بھی اس کو مضبوط نہیں بنا سکتا۔

1938 سے 1947 تک دس سال کا زمانہ میری زندگی میں بہت اہم زمانہ تھا۔ اِس زمانے میں میرا دماغ افکار ونظریات کے اعتبار سے گویا کہ ایک میلٹنگ پاٹ (melting pot) بنا ہوا تھا۔ اُس زمانے میں پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے بارے میں بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ہر تحریر اور ہر تقریر میں اِسی کا چرچا ہوتا تھا۔ فطری طور پر میرا ذہن مختلف خیالات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں پوری مسلم دنیا میں بڑے پیمانے پر فکری سرگرمیاں جاری تھیں۔ بہ ظاہر اِن سرگرمیوں کے مختلف دھارے تھے، لیکن ایک چیز سب میں مشترک تھی، وہ یہ کہ یہ مختلف قسم کی سرگرمیاں اصلاً ردّعمل کے تحت پیدا ہوئیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، اِس زمانے میں مغربی قوموں نے جدید ذرائع کے بل پر پوری مسلم دنیا میں سیاسی اور تہذیبی غلبہ حاصل کرلیا تھا۔ یہ صورت حال مسلم رہنماؤں کے لیے ناقابلِ قبول تھی۔ چناں چہ ہر ایک اِحیاء (revival) کے نام پر اٹھ کھڑا ہوا۔ اِن سب کا مشترک نشانہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے قدیم دورِ عروج کو دوبارہ جدید تاریخ میں واپس لایا جائے۔

مسلمانوں کے اندر اگر یہ سرگرمیاں مثبت ذہن کے تحت پیدا ہوئی ہوتیں، تو ان کا ماڈل زمانۂ رسالت ہوتا۔ اِس ابتدائی ماڈل کی پیروی میں وہ دعوت الی اللہ کو اپنا نشانہ بناتے۔ لیکن اِن سرگرمیوں کا سرچشمہ چوں کی منفی ردعمل تھا، اِس لیے عملاً بعد کو قائم ہونے والا دورِ تاریخ لوگوں کا ماڈل بن گیا۔ لوگ

عباسی سلطنت، اور عثمانی سلطنت، اور مغل سلطنت کے زمانے کو دوبارہ واپس لانے کے نشانے کے تحت، سرگرمِ عمل ہوگئے۔ اِن سرگرمیوں کے دو بڑے دھارے تھے — احیاءِ خلافت، اور احیاءِ جہاد۔

اِن دونوں دھاروں کے تحت بیسویں صدی عیسوی میں غیر معمولی کوششیں کی گئیں، لیکن اپنے مطلوب نشانے کے اعتبار سے یہ کوششیں مکمل طور پر ناکام رہیں۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ یہ لوگ صرف دورِ قدیم کی مسلم تاریخ کو جانتے تھے، اور اِسی قدیم ماڈل کو دوبارہ واپس لانے کے لیے وہ سرگرمِ عمل ہوگئے۔ وہ اِس حقیقت سے بے خبر تھے کہ کامیابی کے لیے دوسری ضروری چیز جو مطلوب ہے، وہ رعایت زمانہ ہے۔ موجودہ زمانے میں کام کے طریقے پوری طرح بدل چکے تھے۔ یہ لوگ اپنی بے خبری کی بنا پر اِس تبدیلی کی رعایت نہ کر سکے، اِس لیے وہ اپنے مطلوب نشانے کو حاصل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔

دوسرا فکری دھارا وہ تھا جس کا کہنا یہ تھا کہ اسلام کو جدید تقاضوں کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے، ورنہ اسلام کو اس کی مطلوب اہمیت حاصل نہ ہو سکے گی۔ اِس نقطۂ نظر کے حامل ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے لکھا تھا کہ — آج ضرورت ہے کہ قرآن دوبارہ نازل ہو:

The Quran has to be re-revealed today.

اِس دوسرے فکری دھارے کو امت میں قبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہ لوگ صرف ایک قسم کا مبتدعانہ گروہ بن کر رہ گئے۔ اِس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ جن افراد نے اِس دوسرے دھارے کی نمائندگی کی، وہ اپنے مشن کے لیے پوری طرح اہل (competent) نہ تھے۔ اُن کا مدعا اصلاً غلط نہ تھا، لیکن وہ طاقت ور انداز میں اس کی درست نمائندگی نہ کر سکے۔ اِس بنا پر وہ اپنے اصل مقصد، دورِ جدید کے اعتبار سے امت کو رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔

راقم الحروف نے اللہ کی توفیق سے، اسلام کی دعوت کو اپنا موضوع بنایا۔ اِس سلسلے میں میں نے وسیع مطالعے کے ذریعے اسلام اور جدید تحدّیات (modern challenges) کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے پایا کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں عام تاثر یہ ہے کہ اسلام جدید دور میں غیر متعلق (irrelevant) ہو گیا ہے۔ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ جدید ذہن کو ایڈریس کر سکے۔ موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین نے جو کتابیں

لکھی ہیں، وہ تقریباً سب کی سب قدیم روایتی اسلوب میں ہیں۔ اِس قسم کی کتابیں جدید تحدیات کا جواب نہیں بن سکتیں۔ یہ کتابیں آج کے ذہن کو اسلام کی صداقت پر مطمئن کرنے کے لیے یقینی طور پر ناکافی ہیں۔

اِس معاملے کا موضوعی مطالعہ (objective study) کرنے کے بعد میں نے یہ پایا کہ جدید دور کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ روایتی ذہنی فریم ورک اب ٹوٹ گیا ہے۔ آج کے انسان کا ذہنی فریم ورک اُس سے بالکل مختلف ہے جو قدیم زمانے کے انسان کا ہوا کرتا تھا۔ ماڈرن افکار کو سمجھنے کے لیے میں نے بہت سی کتابیں پڑھیں۔ اِن میں سے کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں:

1. Thomas Paine, *The Age of Reason* (1994)
2. J.F. West, *The Great Intellectual Revolution* (1965)
3. Julian Huxley, *Religion without Revelation* (1927)
4. A.A.A. Faizi, *A Modern Approach to Islam* (1963)
5. Philip Hodgkiss, *The Making of the Modern Mind* (2001)
6. John Herman Randall, *The Making of the Modern Mind* (1926)
7. Brinton Corone, *The Shaping of the Modern Mind* (1953)
8. W. T. Stace, *Religion and the Modern Mind* (1952)

کامیاب دعوت وہ ہے جو مخاطب کے مائنڈ کو ایڈریس کرے۔ موجودہ زمانے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ قدیم روایتی لٹریچر جدید ذہن کو ایڈریس کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ گویا کہ آج داعی اور مدعو کے درمیان ایک فکری بُعد (intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے۔ اِس لیے اسلامی دعوت کے سلسلے میں پہلا ضروری کام یہ ہے کہ اِس فکری بُعد کو ختم کیا جائے تاکہ اسلام آج کے انسان کے لیے قابلِ فہم (understandable) اور قابلِ قبول (acceptable) بن سکے۔

اِس معاملے میں، میں نے اپنے مطالعے کے ذریعے جانا کہ اِس اعتبار سے جو مسئلہ پیدا ہوا ہے، وہ بنیادی طور پر یہ ہے کہ لمبے فکری عمل کے بعد آج کے انسان کا ذہنی شاکلہ (framework) بدل گیا ہے۔ یہ تبدیلی بنیادی طور پر دو چیزوں میں ہوئی ہے:

1- روایتی معیار کی جگہ سائنسی معیار کا ظہور میں آنا۔

2- حاکمانہ معیار کے بجائے جمہوری معیار کا رواج۔

میں نے اپنے مطالعے کے دوران پایا کہ موجودہ زمانے میں مسلم مصنفین کا پیدا کردہ جو لٹریچر ہے، وہ جدید سائنٹفک معیار پر پورا نہیں اترتا۔ موجودہ دست یاب لٹریچر روایتی زبان میں لکھا گیا ہے۔ وہ اُس سائنٹفک زبان میں نہیں لکھا گیا ہے جو موجودہ زمانے میں قبولیت کا درجہ حاصل کئے ہوئے ہے۔ اِس طرح، کتاب اور قاری کے درمیان جو ذہنی بُعد (intellectual gap) پیدا ہو گیا ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ یہ لٹریچر جدید ذہن کو ایڈریس نہیں کرتا۔

یہی معاملہ دوسرے پہلو کا ہے۔ مسلمانوں کا موجودہ ذہن، قدیم بادشاہی نظام کے تحت بنا ہے، اِس لیے وہ اسلام کو جمہوری انداز میں پیش کرنے سے عاجز رہ گئے۔ چناں چہ اِن مسلمانوں کی باتیں اُس جدید ذہن کو اپیل نہیں کرتیں جو چیزوں کو صرف اُس وقت سمجھ پاتا ہے، جب کہ وہ جمہوری انداز میں پیش کی گئی ہوں۔ مثلاً خلافت کا روایتی تصور قدیم شاہی ذہن کے لیے تو قابلِ تصور تھا، لیکن جدید جمہوری ذہن کے لیے وہ قابلِ فہم نہیں۔ اِسی طرح توہینِ اسلام کے نام پر قتل کی سزا دینا جدید ذہن کے لیے ناقابلِ فہم ہے، کیوں کہ جدید ذہن اِس طرح کی ''گستاخی'' کے تصور سے ناآشنا ہے۔ وہ صرف یہ جانتا ہے کہ اظہارِ خیال کی آزادی (freedom of expression) انسان کا ایک ایسا حق ہے جس کو کسی بھی عذر کی بنا پر منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔

یہی معاملہ مسلّح جہاد (armed struggle) کا ہے۔ موجودہ زمانے میں صرف پُرامن جدوجہد (peaceful struggle) کو قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے۔ حق کے حصول کے لیے پُرامن جدوجہد پوری طرح درست ہے، لیکن مسلح جدوجہد کسی بھی حال میں درست نہیں۔ اِن اسباب کی بنا پر آج کے انسان کو وہ لٹریچر اپیل نہیں کرتا جو جمہوریت کی شرطوں پر پورا نہ اترتا ہو۔

لٹریچر کے اعتبار سے اسلامی تاریخ کے تین بڑے دور ہیں۔ پہلا دور، رسالت اور صحابہ کا دور ہے۔ یہ دور ساتویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس دور میں اسلام کا مستند (authentic) یا کلاسکل لٹریچر (classical literature) وجود میں آیا۔ یہ لٹریچر عربی زبان میں ہے، اور قرآن اور حدیث اور سیرتِ رسول اور سیرتِ صحابہ پر مشتمل ہے۔

دوسرا دور وہ ہے جو عباسی سلطنت کے زمانے میں شروع ہوا اور عثمانی سلطنت اور مغل سلطنت کے زمانے تک جاری رہا۔ یہ دور آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھی گئیں، جو آج اسلامی کتب خانے کا تاریخی حصہ ہیں۔ یہ تمام کتابیں قبل از سائنس دور (pre-scientific era) میں لکھی گئیں۔ چناں چہ یہ کتابیں قدیم روایتی اسلوب میں ہیں، نہ کہ جدید سائنسی اسلوب میں۔

تیسرا دور وہ ہے جو مغرب کے نو آبادیاتی نظام کے زمانے میں ظہور میں آیا۔ یہ دور انیسویں صدی عیسوی اور بیسویں صدی عیسوی کے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس تیسرے دور میں پرنٹنگ پریس وجود میں آچکا تھا اور کاغذ سازی کی جدید صنعت قائم ہوچکی تھی۔ چناں چہ اِس زمانے میں ہزاروں کی تعداد میں اسلامی تعلیمات کے بارے میں کتابیں لکھی اور چھاپی گئیں۔ یہ کتابیں عربی کے علاوہ دوسری مختلف زبانوں میں تھیں۔

مگر تیسرے دور کی کتابیں بھی عملاً دوسرے دور کی کتابوں کا امتداد (extention) بن گئیں، یعنی تحریر اور استدلال کا جو روایتی اسلوب دوسرے دور میں قائم ہوا، وہی بڑی حد تک، تیسرے دور میں بھی جاری رہا۔ تیسرا دور تحریر اور استدلال کے اسلوب کے اعتبار سے وہ دور تھا جس کو سائنسی دور کہا جاتا ہے، مگر تیسرے دور کی کتابیں بھی عملاً دوسرے دور کی کتابوں میں اضافے کے ہم معنی بن گئیں۔ صرف اِس فرق کے ساتھ کہ دوسرے دور میں تیار کی ہوئی کتابیں قلمی کتابیں ہوا کرتی تھیں، جب کہ تیسرے دور کی کتابیں مطبوعہ کتابوں کی صورت میں سامنے آئیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی اٹھارھویں صدی عیسوی کے مشہور عالم ہیں۔ ان کی وفات 1762 میں ہوئی۔ اسلامی عقلیات کے موضوع پر ان کی کتاب 'حجة الله البالغة' ایک اہم کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حجۃ اللہ البالغہ تیسرے دور کے آغاز میں لکھی گئی، مگر وہ پوری طرح روایتی فریم ورک کے مطابق لکھی گئی۔ اِس اعتبار سے وہ دوسرے دور ہی کی ایک تکرار تھی۔

موجودہ زمانے میں اِس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں، اُن میں سے ایک کتاب الجزائری عالم

شیخ محمد حسین الجسر (وفات: 1909) کی کتاب: **الرّسالة الحمیدیة في حقیقة الدّیانة الإسلامیة** ہے۔ اِس کتاب کو مزید اضافے کے ساتھ ان کے صاحب زادے شیخ ندیم حسین الجسر (وفات: 1980) نے شائع کیا ہے۔ اِس دوسری کتاب کا نام یہ ہے: **قصة الإیمان بین الفلسفة والعلم والقرآن** (1961)۔ یہ کتاب پوری کی پوری فلسفیانہ پیٹرن پر لکھی گئی ہے، نہ کہ سائنٹفک پیٹرن پر۔ اِس لیے وہ عصرِ حاضر میں اسلام کی ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔

اِس موضوع پر ایک اور کتاب ڈاکٹر محمد اقبال (وفات: 1938) کی ہے۔ یہ کتاب مصنف کے مختلف خطبات پر مشتمل ہے۔ وہ پہلی بار 1930 میں چھپی تھی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Reconstruction of Religious thought in Islam.

ڈاکٹر اقبال کی یہ کتاب بھی فلسفیانہ پیٹرن پر لکھی گئی ہے، اِس لیے اس کا معاملہ بھی سابقہ کتاب جیسا ہے۔ وہ عصرِ حاضر میں اسلام کی دعوتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔

میرے علم کے مطابق، غالباً صرف ایک کتاب ہے جو براہِ راست طور پر اِس موضوع سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب اصلاً فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اِس کتاب کے مصنف فرانس کے ڈاکٹر موریس بکائی (Maurice Bucaille) ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار 1975 میں شائع ہوئی۔ اِس کتاب کا نام یہ ہے:

The Bible, the Quran, and Science

مگر یہ کتاب بھی اصل ضرورت کو پورا نہیں کرتی۔ اِس کتاب میں قرآن کے صرف ایک پہلو پر کچھ شواہد پیش کئے گئے ہیں۔ وہ دین اسلام کا سائنسی تعارف نہیں۔ اِس اعتبار سے اِس کتاب کو زیادہ سے زیادہ اسلام کی ایک جُزئی خدمت کہا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، راقم الحروف نے عصری اسلوب میں اسلام کے تعارف کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ میری تمام کتابیں، براہِ راست یا بالواسطہ طور پر، اِسی موضوع سے متعلق ہیں۔ میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی پوری زندگی اسی کام پر وقف کردی۔ میرے نزدیک اِس

موضوع کے بنیادی طور پر دو پہلو ہیں— سائنسی اسلوب میں اسلامی تعلیمات کی تبیین، جدید علمی دریافتوں کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو مدلّل انداز میں پیش کرنا۔

مثال کے طور پر، 'تذکیر القرآن' اور 'مطالعۂ سیرت' پہلی قسم کی کتب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور 'مذہب اور جدید چیلنج' اور 'عقلیات اسلام' کو دوسری نوعیت کی کتابوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ میری تقریباً تمام کتابیں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر انھیں دونوں پہلوؤں کی مثالیں ہیں۔

سائنٹفک اسلوب کیا ہے، اس کو ایک لفظ میں، مبنی برحقیقت اسلوب کہا جاسکتا ہے، یعنی حقیقت نگاری کا اسلوب۔ پرنٹنگ پریس کے زمانے میں تصنیف وتالیف کا رواج بہت زیادہ بڑھا اور کثیر تعداد میں کتابیں شائع ہوئیں، لیکن یہ تمام کتابیں قدیم روایتی اسلوب میں تھیں۔ قدیم روایتی اسلوب میں مسجّع اور مقفّیٰ (rhymed) عبارتیں، تمثیلی استدلال، خطیبانہ نثر، انشائیہ اسلوب، شاعرانہ اندازِ تحریر اور ادبی طرزِ نگارش کا رواج تھا۔ یہی اسلوب موجودہ زمانے میں بھی کم وبیش جاری رہا۔

جدید دور میں سائنس کے زیر اثر مذکورہ اسالیب متروک ہوگئے۔ جدید سائنس، حقائق کے مطالعے کا نام تھی، اِس لیے یہی اسلوب دیگر تصنیفی شعبوں میں بھی رائج ہوگیا۔ اِس اسلوب کو ترتیب حقائق (arrangement of facts) کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر موجودہ زمانے میں برٹرینڈرسل کی کتابیں اِسی سائنٹفک اسلوب کا ایک نمونہ ہیں۔ راقم الحروف نے اِسی اسلوب کو اسلام کے تعارف کے لیے اپنایا۔

جہاں تک سائنٹفک اسلوب کے دوسرے پہلو کی بات ہے، یعنی اسلام کی توضیح وتفہیم میں سائنسی دلائل کو استعمال کرنا، اس کو دوسرے لفظوں میں، اسلام کا جدید علم کلام (modern theology) بھی کہا جاسکتا ہے۔ قدیم علم کلام، روایتی استدلال اور یونانی منطق پر قائم تھا۔ جدید علم کلام وہ ہے جو سائنسی استدلال پر قائم ہو۔ سائنسی استدلال سے مراد ہے— جدید دریافت شدہ حقائق کی روشنی میں اسلام کے عقائد کو مدلل کرنا۔

راقم الحروف نے اِس اعتبار سے متعدد کتابیں تیار کیں۔ اِن میں سے ایک کتاب وہ ہے جس کا اردو ٹائٹل 'مذہب اور جدید چیلنج' ہے۔ وہ مختلف ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوچکی ہے۔ عربی زبان میں اس کا

ٹائٹل 'الاسلام یتحدّی' ہے۔ اور انگریزی زبان میں اس کا ٹائٹل گاڈ ارائزز (God Arises) ہے۔

سائنس کی جدید دریافتوں کی بنیاد پر کلامیاتی استدلال کی ایک مثال وہ ہے جس کو ضابطۂ ناکارگی (Law of entropy) کہا جاتا ہے۔ اِس دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مادّی کائنات ازلی نہیں ہوسکتی۔ قدیم یونانی فلاسفہ مادّہ (matter) کو قدیم مانتے تھے۔ اس کے زیر اثر مسلم فلسفی ابن رُشد (وفات: 1198ء) نے مادّہ کو قدیم مان لیا۔ مگر مادّہ کی قدامت کا نظریہ اسلامی عقیدے سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ اِس کے مطابق، خدا اور مادّہ دونوں قدیم ہوجاتے ہیں، جب کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق، خدا قدیم اور ازلی ہے، اور مادّہ بعد کی تخلیق۔ یہ جدید دریافت اسلامی عقیدے کے حق میں سائنسی تصدیق (scientific affirmation) کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضابطۂ ناکارگی کے قانون کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب 'مذہب اور جدید چیلنج' کے باب ''کائنات میں خدا کی گواہی'' کے تحت دیکھا جاسکتا ہے۔ (صفحہ 55)۔

اوپر کی بات نظریاتی اعتبار سے ذہنی فریم ورک سے تعلق رکھتی ہے۔ اب اِس معاملے کے دوسرے پہلو کو لیجئے، یعنی وہ مسئلہ جس کو عملی فریم ورک کہا جاسکتا ہے۔ اِس دوسرے معاملے میں مسلمان موجودہ زمانے میں اتنے اجنبی ہوگئے ہیں کہ موجودہ زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کو وہ آج کی دنیا کے لیے ناموزوں (misfit) نظر آتے ہیں۔

اس کا سبب کیا ہے۔ میرے مطالعے کے مطابق، اِس کا سبب دوبارہ یہ ہے کہ اِس معاملے میں بھی دوسرے دور کا فریم ورک تیسرے دور میں بھی بدستور جاری رہا۔ حالاں کہ تیسرے دور میں ضرورت تھی کہ اِس پہلو سے قدیم ڈھانچے پر نظر ثانی کی جائے اور اس کو جدید مسلّم ڈھانچے کے مطابق بنایا جائے۔ اِس نظر ثانی کا تعلق عقائد میں نظر ثانی سے نہیں ہے، بلکہ منہاج (method) میں نظر ثانی سے ہے۔

عقائد ہمیشہ ابدی ہوتے ہیں، ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مگر منہاج (method) کا تعلق حالات سے ہے۔ فقہ کا مسلّمہ اصول اسی منہاج کے پہلو سے ہے۔ وہ فقہی اصول یہ ہے کہ: **تتغیر الأحکام بتغیّر الزمان والمکان** (زمان اور مکان کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں)۔

مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بار بار مخالف گروپ کی طرف سے قتال کا چیلنج پیش آیا، مگر آپ نے اس کے جواب میں مختلف رویہ اختیار کیا۔

مثال کے طور پر مکی حالات میں آپ نے ہجرت کا طریقہ اختیار فرمایا، یعنی ٹکراؤ کے مقام کو چھوڑ دینا۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر آپ نے خندق (trench) کا طریقہ اپنایا، یعنی اپنے اور مخالف کے درمیان ایک حاجز (buffer) قائم کر دینا۔ اِسی طرح حدیبیہ کے موقع پر آپ نے ٹکراؤ سے اعراض کرنے کے لیے فریقِ مخالف کی یک طرفہ شرطوں کو قبول کرتے ہوئے اُن سے صلح کر لی، وغیرہ۔

جمہوریت (democracy) کا تعلق عملی معاملات سے ہے۔ اور اجتماعی نوعیت کے مشترک معاملات میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ اِس طرح کے معاملات میں جو صورتِ حال پیش آتی ہے، وہ نہ خیرِ مطلق ہوتی ہے اور نہ شرِ مطلق، بلکہ اُن میں دونوں قسم کے پہلو شامل رہتے ہیں۔ اِس لیے اِس طرح کے کسی معاملے کو آئڈیل کے نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے، بلکہ عملی افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اِس طرح کے کسی معاملے میں بہترین اصول یہ ہے کہ — مسائل کو نظر انداز کرو، اور مواقع کو استعمال کرو:

Ignore the problems, avail the opportunities.

موجودہ زمانے میں مسلم رہنماؤں نے قربانی کی حد تک غیر معمولی سرگرمیاں دکھائیں، لیکن اِن سرگرمیوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اِس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ رہنما اپنی سرگرمیوں میں مذکورہ حکمت کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ وہ ہر جگہ مسائل سے ٹکراتے رہے، اور مبنی بر مواقع منصوبہ بندی (opportunity-based planning) کا طریقہ اختیار کرنے میں ناکام رہے۔

پچھلے دو سو سال کے درمیان مسلم دنیا میں جو سرگرمیاں جاری رہی ہیں، ان کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اِس پوری مدت میں مسلم رہنما ٹکراؤ کے اصول پر عمل کرتے رہے۔ ہر مقام پر انھوں نے ایک مسئلہ (problem) دریافت کیا اور اِس پرابلم سے ٹکرانے میں اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اُن کی سوچ یہ تھی کہ جب تک یہ پرابلم ختم نہ ہو، اُس وقت تک کوئی مثبت کام نہیں کیا جا سکتا — کہیں یہودی پرابلم، کہیں برٹش پرابلم، کہیں امریکن پرابلم، کہیں نوآبادیاتی پرابلم، کہیں ہندو پرابلم، کہیں ظالم

حکومت کا پرابلم، کہیں کوئی اور پرابلم، یہی ہر جگہ مسلم رہنماؤں کا نشانۂ عمل بنا رہا۔

اس طریقِ کار کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ خدا کے تخلیقی نقشے کے خلاف تھا۔ خدا نے اپنے تخلیقی نقشے کے مطابق، موجودہ دنیا میں انسان کو مکمل آزادی عطا فرمائی ہے۔ انسان کو اپنی آزادی کا صحیح استعمال کرنے کا بھی اختیار ہے، اور اس کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اپنی خداداد آزادی کو غلط طور پر استعمال کرے۔ انسان کی اِس آزادی کو صرف قیامت منسوخ کرے گی۔ اِس سے پہلے کوئی شخص اس کو منسوخ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ موجودہ دنیا کے تمام مسائل اسی انسانی آزادی کے غلط استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ چوں کہ ہم انسان کی آزادی کو منسوخ نہیں کر سکتے، اِس لیے ہم یہ بھی نہیں کر سکتے کہ اُن چیزوں کو دنیا سے ختم کر دیں جن کو ہم اپنے لیے قومی یا سیاسی مسئلہ سمجھتے ہیں۔

خدا کے قائم کردہ اِس تخلیقی نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس دنیا میں ہمارے لیے جو انتخاب (choice) ہے، وہ صحیح (right) اور غلط (wrong) کے درمیان نہیں ہے، بلکہ یہ انتخاب چھوٹے شر (lesser evil) اور بڑے شر (greater evil) کے درمیان ہے۔ کسی صورتِ حال میں ہمارے عمل کی منصوبہ بندی اِس تصور کے تحت نہیں ہو سکتی کہ ہم یہ دیکھیں کہ اصولی اعتبار سے درست کیا ہے اور نادرست کیا، اور پھر جو چیز ہمیں اصولی طور پر درست نظر آئے، اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم پُرشور جدوجہد شروع کر دیں۔ اِس کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ ہم یہ دیکھیں کہ عملی اعتبار سے جو دو انتخاب ہمارے لیے ممکن ہیں، اُن میں سے کون سا انتخاب اَہوَن (easier) ہے اور کون سا غیر اہون (non-easier)۔ اِسی اصول کو فقہ میں اهون البليّتين کہا جاتا ہے، یعنی دو مصیبتوں میں سے آسان (easier) مصیبت۔

یہ فطرت کا اصول ہے۔ اِس اصول کو اختیار کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ ہر صورت حال میں آدمی کو بلا تاخیر اپنے عمل کے لیے ایک نتیجہ خیز نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے، اور کسی صورتِ حال میں حقیقی نقطۂ آغاز کا ملنا کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ اِس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کسی مزید نقصان میں مبتلا ہوئے بغیر نتیجہ خیز عمل شروع کر دیتا ہے اور آخر کار وہ اپنے مطلوب تک پہنچ جاتا ہے۔

موجودہ زمانے میں حالات مکمل طور پر بدل چکے ہیں۔ اِس لیے ضروری ہے کہ منہاج کے

معاملے میں نئے ماڈل کو اختیار کیا جائے۔ یہ ماڈل اصولی طور پر نتیجہ (result) کی بنیاد پر ہوگا، یعنی جو ماڈل اسلام کے لیے بہ اعتبار نتیجہ مفید ہو، اس کو اختیار کرنا اور اُس ماڈل کو چھوڑ دینا جو نتیجے کے اعتبار سے کاؤنٹر پروڈکٹیو (counter productive) ثابت ہونے والا ہو۔

اِس اعتبار سے موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ جدید جمہوری ماڈل کو اختیار نہ کر سکے۔ وہ جدید جمہوری نظام میں بھی قدیم حاکمانہ ماڈل پر قائم رہنا چاہتے ہیں، حالاں کہ جدید حالات میں عملاً یہ ممکن ہی نہیں۔ اِس قسم کے اصرار کا نتیجہ صرف دو صورتوں میں برآمد ہوگا۔ یا تو مسلمان ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کریں جو بلاشبہہ خودکشی کے ہم معنیٰ ہے، یا پھر وہ منافق بن جائیں، یعنی اپنی ذہنی سوچ کے اعتبار سے وہ حاکمانہ ماڈل کو اپنائے ہوئے ہوں اور عملی اعتبار سے مصلحت کا انداز اختیار کر کے وہ اپنے مادی مفاد کو بچانے کی کوشش کریں۔

اِس معاملے میں تفصیلی مطالعے کے بعد میں نے کئی کتابیں لکھیں۔ میں نے اپنی کتابوں میں بتایا کہ جمہوری ماڈل اگرچہ بہ ظاہر ایک نیا ماڈل ہے، لیکن اُس میں اور اسلام کی حقیقی تعلیمات میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ ہم اپنی اسلامی حیثیت کو پوری طرح باقی رکھتے ہوئے جمہوری نظام میں اپنے آپ کو شامل کر سکتے ہیں۔ یہاں میں چند مثالوں کی روشنی میں اس کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

موجودہ زمانے میں جن چیزوں کی بنا پر اسلام کے بارے میں یہ عالمی تاثر قائم ہو گیا ہے کہ اسلام جدید حالات کا ساتھ نہیں دیتا، اسلام جدید دور کے لیے ایک غیر متعلق مذہب ہے۔ یہ تاثر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی قومی روش کی بنا پر قائم ہوا ہے، نہ کہ اسلام کی اصل تعلیمات کی بنا پر۔

1- مثال کے طور پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ اپنے رسول کی شان میں ''گستاخی'' کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اپنے مذہبی عقیدے کی بنا پر ان کے اوپر فرض ہے کہ وہ ایسے انسان کو قتل کر ڈالیں۔ مسلمانوں کا یہ نظریہ دورِ جدید کے تصورات سے ٹکراتا ہے۔ کیوں کہ موجودہ زمانے کا یہ مسلّمہ ہے کہ ہر شخص کو پُرامن اظہار رائے کی آزادی ہے۔ اِس آزادی کو کسی بھی حال میں ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ ٹکراؤ جدید دور اور مسلم تصورات کے درمیان ہے، نہ کہ جدید دور اور اصل

اسلامی تعلیمات کے درمیان۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں بھی اظہارِ خیال کی آزادی اُسی کامل درجے میں دی گئی ہے جس کو جدید دور کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اِس معاملے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب 'شتمِ رسول کا مسئلہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

2- یہی معاملہ سیکولرازم کا ہے۔ موجودہ زمانے میں سیکولرازم کو اسٹیٹ پالیسی کا معیاری ماڈل سمجھا جاتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے اسلام پسند مسلم رہ نماؤں نے یہ اعلان کیا کہ سیکولرازم، اسلام کے سراسر خلاف ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم سیکولر نظام کے خلاف لڑکر اس کا خاتمہ کریں۔ لیکن یہ ٹکراؤ بھی جدید دور اور مسلمانوں کے درمیان ہے، نہ کہ جدید دور اور اسلام کے درمیان۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خود بھی مشترک سماج کے لیے اُسی طرح سیکولر پالیسی کا حامی ہے، جس طرح جدید دور میں سمجھا جاتا ہے۔ اِس مسئلے کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب 'دینِ کامل' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح کا ایک معاملہ وہ ہے جو جمہوریت (democracy) سے تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ زمانے کے اسلام پسند مسلم لیڈروں نے اعلان کیا کہ جمہوریت ایک غیر اسلامی نظریہ ہے، اِس لیے وہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف، جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ جمہوریت کا ماڈل سب سے بہتر سیاسی ماڈل ہے۔ مگر یہ ٹکراؤ بھی جدید ذہن اور موجودہ مسلمانوں کے درمیان ہے، نہ کہ جدید ذہن اور اصل اسلام کے درمیان۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام خود بھی سیاسی تنظیم کے لیے جمہوری طریقے کا حامی ہے۔ اسلام میں تھیاکریٹک اسٹیٹ (theocratic state) کا تصور نہیں۔ اسلام مکمل طور پر جمہوری نظام کا قائل ہے، یعنی عوام کی رائے کے مطابق، سیاسی نظام کی تشکیل۔

اِس موضوع کی وضاحت میں نے اپنی مختلف کتابوں میں کی ہے۔ مثلاً 'فکرِ اسلامی' اور 'مسائل اجتہاد' وغیرہ۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقیدہ اور عبادت کا تعلق ہے، اِس معاملے میں اسلام کی تعلیمات مطلق حکم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن جہاں تک اجتماعی نظام کا معاملہ ہے، اس کا کوئی مطلق معیار نہیں۔ اجتماعی نظام کا معاملہ عوام کی اجتماعی صورتِ حال پر منحصر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: **كما تكونون كذلك يؤمّر عليكم** (البيهقي، رقم الحديث: 6896) یعنی

جیسے تم ہوگے، ویسے ہی تمھارا حکومتی نظام ہوگا۔

اجتماعی نظام کے معاملے میں اسلام کا اصول اِس پر مبنی ہے کہ عوام یا معاشرہ کی استعدادِ قبولیت کس درجے کی ہے۔ عوام کے اندر جن اجتماعی احکام کی قبولیت کی استعداد ہوگی، اُن کو آغاز میں نافذ کیا جائے گا، لیکن جن احکام کی قبولیت کی استعداد عوام کے اندر موجود نہ ہوگی، اُن احکام کی تنفیذ کا آغاز خود قانون کے نفاذ سے نہ ہوگا، بلکہ ذہن سازی کے عمل سے ہوگا۔ اسلام کے اِس اصول کو تدریج کا اصول کہہ سکتے ہیں، یعنی عوام کی استعداد کے مطابق، احکام کا تدریجی نفاذ، نہ کہ ان کا بہ یک وقت نفاذ۔

موجودہ دنیا چوں کہ امتحان کی مصلحت کے تحت بنائی گئی ہے، اِس لیے یہاں انسان کو کامل آزادی دی گئی ہے۔ یہ آزادی خود خدا کے تخلیقی نقشے کے مطابق ہے، اِس لیے کوئی بھی طاقت اس کو منسوخ نہیں کرسکتی۔ تجربہ ہے کہ انسان زیادہ تر اِس آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اِسی بنا پر ایسا ہوا کہ تاریخ میں کبھی معیاری نظام نہ بن سکا، اور نہ آئندہ اِس کا کوئی امکان ہے۔ مومن اور غیر مومن دونوں مجبور ہیں کہ اِس غیر معیاری دنیا میں وہ اپنی زندگی کا نقشہ بنائیں۔ اِسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ — اِس دنیا میں معیار کبھی حاصل نہیں ہوسکتا:

The Ideal can not be achieved in this world.

اِس صورتِ حال کی بنا پر اسلام کا اصول یہ ہے کہ معیار کے حصول کے لیے جنگ نہ کی جائے، بلکہ کسی صورتِ حال میں عملی طور پر جو ممکن ہو، اس کو مان کر اپنی زندگی کا نقشہ بنایا جائے۔ اِس اصول کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر صورتِ حال میں فوراً ہی ایک نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے۔ ہر صورتِ حال میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی فوری طور پر اپنے عمل کا نقشہ بنائے، تاکہ جو کچھ آج قابلِ حصول نہ تھا، وہ مستقبل میں قابلِ حصول ہوجائے۔

ضروری اعلان

جنوری 2012 سے ماہ نامہ الرسالہ کی قیمت -/15 روپے ہوگی،

اور اُس کا سالانہ زرِتعاون -/150 روپے ہوگا۔

راستہ بند ہے

ایک مرتبہ میں بذریعہ روڈ سفر کررہا تھا۔ ہماری گاڑی تیز چلتی ہوئی ایک مقام پر پہنچی تو وہاں سڑک کے بیچ میں ایک بورڈ لگا ہوا تھا— راستہ بند ہے:

Road Closed

ہماری گاڑی اچانک رک گئی۔ ڈرائیور نے نہایت اطمینان کے ساتھ کہا کہ راستہ آگے کی طرف بند ہے، لیکن پیچھے کی طرف تو راستہ کھلا ہوا ہے۔ ڈرائیور نے صورتِ حال کے خلاف، شکایت یا احتجاج میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ اس نے فوراً گاڑی کو موڑا اور دوبارہ پیچھے کی طرف سفر کرنا شروع کردیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک اور سڑک مل گئی۔ ڈرائیور گاڑی کو اِس روڈ پر لے آیا۔ اب ہماری گاڑی دوبارہ تیزی کے ساتھ آگے کی طرف دوڑنے لگی۔ یہاں تک کہ ہم لوگ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

یہی زندگی کے سفر کا معاملہ ہے۔ زندگی کے سفر میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی مقام پر ایسی رکاوٹ پیش آجاتی ہے، جب کہ آگے کے لیے ہموار سفر ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر درست طریقہ صرف ایک ہوتا ہے، وہ یہ کہ آدمی آگے بڑھنے کے لیے اصرار نہ کرے، بلکہ وہ پیچھے کی طرف لوٹ جائے۔ وہ اِس واپسی کو مزید تیاری کے لیے استعمال کرے۔

There is always room at the top.

یہی معاملہ انسانی سفر کا بھی ہے۔ انسانی سفر میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ پیچھے کی طرف راستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے:

There is always a way back.

اِس طرح ہر لمحہ فرد یا قوم کی دانش مندی کا امتحان ہوتا ہے۔ جو لوگ اِس دانش مندی میں پورے اتریں، وہی لوگ اِس دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کریں گے۔

شکایت کے بجائے اصلاح

ایک مسلمان تاجر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے پچھڑے پن کی شکایت کی۔ میں نے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اِس کا سبب امتیاز (discrimination) ہے۔ انڈیا میں مسلمانوں کے ساتھ ہر شعبے میں امتیاز برتا جاتا ہے، اِسی لیے وہ ابھی تک ترقی نہ کر سکے۔ میں نے پوچھا کہ آپ ایک تاجر ہیں، لیکن آپ کے یہاں جتنے کارکُن ہیں، وہ سب ہندو ہیں، مسلمان نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ خود مسلمانوں کے ساتھ کیوں امتیاز برتتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اِس کا سبب یہ ہے کہ ہندوؤں میں پروفیشنل ازم (professionalism) ہے، جب کہ مسلمانوں کے اندر پروفیشنل ازم نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کی جس کمی کی بنا پر، آپ مسلمانوں کے ساتھ ''امتیاز'' برتتے ہیں، اُسی کمی کی بنا پر اگر دوسرے لوگ مسلمانوں کے ساتھ امتیاز برتیں تو آپ کو شکایت کا کیا حق۔

میں نے کہا کہ آپ دوسروں کی شکایت کرنے کے بجائے یہ کیجئے کہ مسلمانوں کی خود اپنی کمی کو دور کیجئے، اِس کے بعد یہ مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اِس کی صورت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سوچ کو درست کرنے کا معاملہ ہے۔ آپ صرف یہ کیجئے کہ تعمیرِ فکر کے موضوع پر ہماری پانچ کتابیں بڑی تعداد میں خرید کر مسلمانوں میں پھیلا دیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ ان شاء اللہ مسلمانوں کی حالت بدل گئی ہے۔ وہ پانچ کتابیں یہ ہیں — رازِ حیات، رہنمائے حیات، تعمیرِ حیات، حکمتِ اسلام، کتابِ زندگی۔

مقابلے کی اِس دنیا میں کامیابی اور ناکامی دونوں کا تعلق آدمی کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ لیاقت (competance) کا ثبوت دینے والا آدمی اِس دنیا میں کامیاب ہوتا ہے۔ مگر جو شخص لیاقت کا ثبوت نہ دے سکے، اس کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ اِس دنیا میں ناکام ہو کر رہ جائے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ شکایتِ غیر میں وقت ضائع نہ کرے، بلکہ وہ ہمہ تن تعمیرِ خویش میں لگ جائے۔

گھر آگے، میں پیچھے

ایک صاحب کے پاس پہلے رہنے کے لیے چھوٹا گھر تھا۔ بعد کو ان کے حالات بہتر ہوئے اور انھوں نے شہر میں ایک بڑا گھر خرید لیا۔ یہ گھر سڑک کے کنارے تھا اور اپنی تعمیر کے اعتبار سے شان دار دکھائی دیتا تھا۔ اُسی زمانے میں ایک پروگرام کے تحت میں اُس شہر میں گیا۔ مذکورہ صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ گھر کے اندر بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب سے میں نے یہ بڑا گھر لیا ہے، یہ گھر میرے آگے چلتا ہے اور میں اُس کے پیچھے چلتا ہوں۔ اب جو شخص بھی یہاں آتا ہے، وہ صرف گھر کے بارے میں بات کرتا رہتا ہے۔ اب آنے والا کوئی شخص مجھ سے کسی اور موضوع پر بات نہیں کرتا۔

یہ صرف ایک گھر کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ اِس قسم کے ہر معاملے کی بات ہے۔ کوئی مشن، جب معمولی مکان میں ہو تو اُس وقت لوگ صرف مشن کی بات کرتے ہیں اور جب اس کی شان دار بلڈنگ بن جائے تو بلڈنگ اولین (primary) اہمیت حاصل کر لیتی ہے اور مشن کی حیثیت ثانوی (secondary) ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک سادہ مسجد ہو تو لوگ اس کے اندر متقیانہ نماز پڑھتے ہیں، اور جب ایک شاندار قسم کی ائر کنڈیشنڈ مسجد بن جائے تو وہاں تقویٰ کا ماحول ختم ہو جاتا ہے۔ اس معاملے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبال نے بجا طور پر کہا تھا:

میں ناخوش و بے زار ہوں مرمر کی سِلوں سے　　میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

مجھے ایک مدرسے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پہلے یہ مدرسہ ایک معمولی عمارت میں قائم تھا۔ اب اس کے رقبے میں کافی توسیع ہوئی ہے اور وہاں بڑی بڑی پختہ عمارتیں بن گئی ہیں۔ میں نے وہاں کے ایک سینئر استاذ سے کہا کہ آپ کے مدرسے نے ماشاء اللہ کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ہاں، مادّی ترقی تو ہوئی ہے، لیکن پہلے یہاں جو معنویت نظر آتی ہے، اب اس کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

یہی وجہ کہ اسلام میں سادگی پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ سادگی اور اسلام دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں سادگی ہے، وہاں اسلام ہے اور جہاں سادگی نہیں، وہاں اسلام بھی نہیں۔

سوال وجواب

دعوتی کام کے دوران بعض لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے سوالات آتے ہیں۔ یہاں اِس طرح کے چند سوالات درج کئے جاتے ہیں۔ براہِ کرم، ان کا جواب دے کر ممنون فرمائیں (حافظ ابوالحکم محمد دانیال، بی ایس سی، پٹنہ، بہار)

سوال: دعوت الی اللہ کے کام کی موثر انجام دہی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ قولی شہادت اور عملی شہادت، یعنی دعوت کے نکات کا نظری بیان (theoratical statement) اور دعوت کے نکات کا عملی مظاہرہ (practical demonstration)۔ کسی دعوتی مہم میں جب تک ایسا نہ کیا جائے کہ قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت کو جمع کر دیا جائے، اُس وقت تک وہ دعوت مکمل دعوت نہ ہوگی اور اُس سے اتمامِ حجت کا فائدہ حاصل نہ ہو سکے گا۔

جواب: قرآن کے مطابق، دعوت الی اللہ کا کام اصلاً انذار وتبشیر (4: 165) کا کام ہے۔ انذار وتبشیر کا یہ کام ہمیشہ قول کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ تمام انبیا، بشمول خاتم الانبیا نے قول کی سطح پر دعوت کا کام انجام دیا اور اس کو اتمام حجت تک پہنچایا۔

دعوت الی اللہ کے نکات کیا ہیں۔ وہ نکات ہیں — توحید، وحی، ملائکہ، محاسبۂ آخرت، جنت، دوزخ، وغیرہ۔ یہی دعوت کے اصل نکات ہیں، اور یہ سب کے سب امورِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان نکات کو مشہود بنانا یا اُن کا عملی مظاہرہ (practical demonstration) کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ ایسی حالت میں عملی شہادت کو دعوت کا جز بنانا تکلیف مالا یطاق کے ہم معنی ہے، یعنی داعی پر ایک ایسے کام کی ذمہ داری ڈالنا جو عملاً اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

سوال: حدیث میں آتا ہے کہ: الأئمة من قريش (مصنف ابن أبي شيبة، رقم: 31710) یعنی امام قریش میں سے ہوں گے۔ اِس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیادت کا کام قریش کا کام ہے۔ اِس میں دعوت الی اللہ کے کام کا استثنا نہیں۔ اِس حدیث کے مطابق، ہمارا پہلا کام یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کے کام کو انجام دینے کے لیے ہم ایک قریشی گائڈ مقرر کریں اور اس کی ماتحتی میں دعوت الی اللہ کا کام کریں۔

جواب: مذکورہ حدیث کا یہ مطلب لینا درست نہیں۔ یہ حدیث ایک وقتی مصلحت کو بتاتی ہے، وہ کسی عمومی اسلامی حکم کا بیان نہیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: **لا فضل لعربي على عجمي، ولا لعجمي على عربي، ولا لأحمر على أسود، ولا لأسود على أحمر، إلا بالتقوىٰ** (مسند أحمد، رقم الحديث: 22872) یعنی نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر، اور نہ ہی کسی گورے کو کالے پر اور نہ ہی کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے، سوا تقویٰ کے۔

الأئمة من قريش کا اگر وہ مطلب لیا جائے جو سائل نے لیا ہے تو دونوں حدیثوں میں تضاد واقع ہو جائے گا۔ اِس لیے حدیث کا مذکورہ مفہوم لینا درست نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث صرف ایک وقتی مصلحت کو بتاتی ہے، نہ کہ شریعت کے کسی دائمی اصول کو۔ وہ مصلحت یہ ہے کہ سیاسی عہدے کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ ایسے شخص کو عہدے دار بنایا جائے جس کے ساتھ قیادت کی روایات شامل ہوں۔ قدیم زمانے میں مخصوص اسباب کی بنا پر قبیلۂ قریش کو عرب میں قیادت کا درجہ مل گیا تھا۔ اُس زمانے کے اہلِ عرب صرف قریش کی قیادت کو قبول کر سکتے تھے، کسی اور کی قیادت کو نہیں۔

الأئمة من قريش کی اِس تاویل کی تائید ایک اور روایت سے ہوتی ہے۔ اِس دوسری روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **الناس تبع لقريش** (صحيح مسلم، رقم الحديث: 1818) یعنی اہلِ عرب، قریش کے تابع ہیں۔ قریش کی قیادت کو وہ بہ آسانی قبول کر لیں گے، کسی اور کی قیادت کو قبول کرنا عربوں کے لیے عملاً ممکن نہیں۔

سوال: امت کے مختلف حلقے الگ الگ جو کام کر رہے ہیں، اُن سب کو یکساں طور پر درست مانتے ہوئے ان کا اعتراف کرنا چاہئے۔ ہر حلقے کو صرف اپنا کام کرنا چاہیے۔ اُس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ دوسروں کے کام یا اُن کی فکر پر تنقید کرے۔

جواب: ہر فرقے کو درست ماننا اور اُس پر تنقید نہ کرنا، یہ کوئی صحیح مسلک نہیں۔ اِس قسم کا مطالبہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ امت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کو عملاً مستقل طور پر منسوخ کر دیا جائے۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ تنقید کو صرف دلائل پر مبنی ہونا چاہیے، نہ کہ عیب جوئی اور الزام تراشی پر۔

جو چیز ممنوع ہے، وہ تشدد ہے۔ تنقیص (عیب جوئی) انفعالی تشدد (passive violence) ہے، اور جارحیت (agression) عملی تشدد (active violence)، اور یہ دونوں قسم کا تشدد اسلام میں حرام ہے۔ اگر تنقید (علمی تحلیل وتجزیہ) کو غلط قرار دیا جائے تو عمر بن عبدالعزیز سے لے کر آج تک کے تمام علماء کو غلط قرار دینا پڑے گا، کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ علماءِ امت کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ جس چیز کو انھوں نے قرآن اور سنت کی روشنی میں غلط سمجھا، اُس کو انھوں نے کھل کر غلط قرار دیا۔

سوال: دعوت الی اللہ کا کام امت کو ساتھ لے کر ہی ہوسکتا ہے۔ داعی اگر امت کے درمیان خوش نام نہ رہے تو امت اس کا ساتھ نہیں دے گی، اور داعی کو اگر امت کی حمایت حاصل نہ رہے تو دعوت کا کام موثر طور پر انجام دینا ممکن نہیں، اِس لیے داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ امت کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے کام کرے۔ اگر کوئی داعی، امت کے درمیان نیک نام نہ رہے تو جو لوگ ایسے داعی کا ساتھ دیں گے، وہ بھی موثر دعوت کا کام کرنے میں ناکام رہیں گے۔

جواب: اِس سوال کے جواب میں، میں دو باتیں کہوں گا—ایک، یہ کہ دعوت کا کام اللہ کا کام ہے۔ وہ صرف اللہ کی نصرت سے انجام پاتا ہے۔ نصرتِ الٰہی کے سوا کوئی اور چیز دعوت الی اللہ کے کام کو کامیابی تک پہنچانے والی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کی حمایت پر بھروسہ کرنا اپنی نوعیت کے اعتبار سے شرک کا درجہ رکھتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ دعوت کا کام خدا کی توفیق پر چلتا ہے، نہ کہ کسی غیر خدا کی توفیق پر۔ اِس دنیا میں اللہ کے سوا کسی کو سرے سے یہ طاقت ہی حاصل نہیں کہ وہ کسی کام کو کامیاب یا ناکام کر سکے۔

قرآن کے مطابق، داعی کے اندر جو صفات مطلوب ہیں، وہ صرف دو ہیں—نُصح اور امانت (إني لكم ناصح أمين)۔ نصح کا مطلب یہ ہے کہ داعی کسی بھی قسم کے ذاتی یا قومی مفاد کے بجائے صرف مدعو کی خیر خواہی کے لیے کام کرے۔ امانت کا مطلب یہ ہے کہ داعی اپنی کوئی بات دعوت میں شامل نہ کرے، وہ صرف اُس چیز کا مبلغ بنے جو اللہ نے اپنی کتاب میں بتائی ہے۔ داعی کے لیے کسی اور مصلحت کا اعتبار کرنا، رکون (11:113) ہے، اور رکون داعی کے لیے صرف ایک غیر مطلوب صفت ہے، وہ کوئی مطلوب صفت نہیں۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آج ہم امت کے مابعد زمانے میں ہیں۔ امت کے مابعد زمانے کے بارے میں کثرت سے حدیثیں آئی ہیں، جن میں یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ بعد کے زمانے میں امت عمومی طور پر دینی انحراف کا شکار ہوجائے گی۔ چناں چہ احادیث میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب امت پر ایسا وقت آجائے تو اُس وقت ضرورت ہوگی کہ امت کے اندر اصلاح اور تجدید کا کام کیا جائے۔

اِس حقیقت کو دوسرے الفاظ میں اِس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ بعد کے زمانے میں امت کی حیثیت بھی دوسرے مدعو گروہوں کی طرح ایک مدعو گروہ کی ہوجائے گی۔ اور یہ واضح ہے کہ جب امت خود ایک مدعو گروہ کی حیثیت اختیار کرلے تو اُس وقت اصل کام امت کی حمایت حاصل کرنا نہیں رہتا، بلکہ اصل کام یہ ہوتا ہے کہ امت کو دوبارہ اصل دینِ خداوندی پر لایا جائے۔ انحراف کے اِس مرحلے میں، امت کے مزاج کی رعایت کرنا، امت کی اصلاح کے کام کو معطل کرنے کے ہم معنی ہے جو یقینی طور پر درست نہیں۔

سوال: دعوت الی اللہ یہ ہے کہ علماءِ متقدمین کی قدیم اسلامی کتابوں کو لوگوں تک پہنچایا جائے۔ قدیم کتابوں کے ترجمے دوسری زبانوں میں کئے جائیں۔ قدیم کتابیں پہلے بھی دین کی تبیین کے لیے کافی تھیں اور آج بھی وہ دین کی تبیین کے لیے کافی ہیں۔ دعوت الی اللہ کے کام کے لیے ہمیں کسی نئے دعوتی لٹریچر کی ضرورت نہیں۔

جواب: دین کی خدمت کے لیے دو قسم کا لٹریچر مطلوب ہے۔ ایک، وہ کتاب جس میں دینی احکام کا بیان ہو۔ دوسری کتابیں وہ ہیں جن کو داعی اپنے معاصر ذہن کو خطاب کرنے کے لیے استعمال کرے۔ جہاں تک پہلی ضرورت کا تعلق ہے، اُس کے لیے قدیم کتب مفید ہیں۔ دین کی اساسی تعلیمات کو جاننے کے لیے علماءِ متقدمین کی کتابیں بلاشبہہ پہلے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اِس معاملے میں دوسرا کوئی بھی لٹریچر اِن کتابوں کا بدل نہیں بن سکتا۔

مگر دعوت الی اللہ کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ دعوت کے عمل میں صرف یہ مطلوب نہیں ہوتا کہ احکام دین کو اپنی ابتدائی شکل میں بیان کردیا جائے، بلکہ اِس مقصد کے لیے لازمی طور پر یہ ضروری ہوتا ہے کہ مدعو کے ذہن کو سمجھا جائے اور مدعو کے قابلِ فہم اسلوب میں اس کو بیان کیا جائے۔ یہی وہ

دعوتی ضرورت ہے جس کو قرآن میں اِن الفاظ میں بتایا گیا ہے: **وقل لهم فی أنفسهم قولاً بليغاً** (4:63) یعنی تم اُن سے ایسی بات کہو جو اُن کے دلوں میں اتر جائے۔

مثال کے طور پر مدعو اگر عقلی اور منطقی اسلوب میں بات کو سمجھنا چاہتا ہو تو اس کے لیے تمثیلی اسلوب غیر موثر ہوگا۔ اِس طرح کے کیس میں داعی کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ تمثیلی اسلوب کے بجائے عقلی اور منطقی اسلوب میں اپنی بات کہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا زمانہ ہے۔ قدیم دور اگر روایتی اسلوب کا دور تھا تو جدید دور سائنٹفک اسلوب کا دور ہے۔ ایسی حالت میں، آج کے انسان کے سامنے موثر طور پر دین کا پیغام پہنچانے کے لیے یقینی طور پر ضروری ہے کہ جدید ذہن کی رعایت سے مثبت لٹریچر تیار کیا جائے۔ اور اگر کسی نے اِس طرح کا لٹریچر تیار کیا ہے تو اُس کو کسی تعصب کے بغیر استعمال کیا جائے۔ اِس معاملے میں اِن دو کے سوا کوئی تیسری صورت ممکن نہیں۔

کشمیر میں الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ حاصل کرنے کے لیے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کریں:

Mukhtar Majeed
C/O Majeed Sweets, General Bus Stand,
Pulwama, Kashmir
Mobile: +91-9906400693

Firdous Ahmad Dar
Hyland Colony ITI, Sopore
Distt. Baramulla, J&K
Mobile: +91-9419481102, 9697398372
Email: firdousdar@gmail.com

بجنور (یوپی) میں الرسالہ اور مطبوعاتِ الرسالہ حاصل کرنے کے لیے اس پتے پر رابطہ قائم کریں:

Mahtab Ahmad
Quran Book Centre
Mahalla: Pahadi Darwaza, Dham Pur-246 761
Phone: 01344220361

خبرنامہ اسلامی مرکز—213

1- دارالمصنفین شبلی اکیڈمی (اعظم گڑھ، یوپی) کی لائبریری کے لیے جون 2011 کے آخری ہفتے میں بذریعہ ڈاک صدر اسلامی مرکز کی کتابوں کا ایک سیٹ بھیجا گیا ہے۔ یہ سیٹ سی پی ایس کی طرف سے، دارالمصنفین کے موجودہ صدر ڈاکٹر اشتیاق احمد ظلی کے ایما پر روانہ کیا گیا۔

2- نئی دہلی کے لودھی گارڈن میں 30 جولائی 2011 کی شام کو اسپیچول آؤٹنگ (Spiritual Outing) کا ایک پروگرام ہوا۔ اس میں سی پی ایس (نئی دہلی) کے علاوہ، کچھ دوسرے مقامات کے لوگ بھی شریک تھے۔ یہاں صدر اسلامی مرکز نے ایک تربیتی تقریر کی۔ خاص طور پر شکر کی اہمیت بتائی گئی۔ مغرب کی باجماعت نماز پر یہ پروگرام ختم ہوا۔

3- امریکا میں مقیم الرسالہ مشن کے ساتھیوں کے لیے صدر اسلامی مرکز کا ٹیلی فونی خطاب مسلسل جاری ہے۔ اِس سلسلے میں 31 جولائی 2011 کو Unity and Dawah کے موضوع پر ایک خطاب ہوا۔ اِس کو ٹیلی کانفرنسنگ کے ذریعے امریکا کے مختلف شہروں میں سنا گیا۔ تقریر کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔

4- جموں وکشمیر میں جاری امرناتھ یاترا (جولائی، اگست 2011) کے دوران سی پی ایس (کشمیر) کی طرف سے یہاں آنے والے یاتریوں کو قرآن کا ہندی، انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر پر دیا گیا۔ نیز کشمیری مسلمانوں کو صدر اسلامی مرکز کا نیا پمفلٹ ''شاہ ہمدان مشن'' برائے مطالعہ دیا گیا۔

5- مسٹراے کے اوستھی (جیلر، سہارن پور) کی دعوت پر سی پی ایس (سہارن پور) کی ٹیم کے ممبران 5 اگست 2011 کو وہاں کی جیل میں قیدیوں سے ملاقات کے لیے گیے۔ اِس موقع پر اِن لوگوں نے جیل کے اسٹاف اور وہاں کے قیدیوں کو اردو، ہندی اور انگریزی میں قرآن کا ترجمہ اور دعوتی لٹریچر برائے مطالعہ پیش کیا۔ مزید یہ کہ ان لوگوں نے جیل میں قیدیوں کے ٹیچر مسٹر انل کمار یادو کے پاس دعوتی میٹریل رکھ دیا، تاکہ وہاں سے مزید لوگوں کو دیا جاسکے۔ مسٹر یادو نے ان کتابوں کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر محمد اسلم خان کو فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ آئندہ ہم جیل میں قیدیوں کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً آپ لوگوں کا پروگرام رکھیں گے، اِس سے ہم کو بہت مدد ملے گی۔

6- انڈونیشین ایمبسی (نئی دہلی) میں دو پروگرام ہوئے—ایک 9 اگست 2011 کو اور دوسرا 18 اگست 2011 کو انڈونیشیا کے نیشنل ڈے کے موقع پر۔ ایمبسی کی دعوت پر سی پی ایس انٹرنیشنل (نئی دہلی) کے ممبران اِس میں شریک ہوئے۔ اِن پروگراموں میں دنیا کے تمام مسلم اور غیر مسلم ممالک کے ایمبیسڈر اور اعلیٰ سرکاری افسران شامل تھے۔ اِن تمام لوگوں کو سی پی ایس کی طرف سے قرآن کا انگریزی اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ لوگوں نے اِس کو بہت شوق سے لیا۔ یہاں انڈونیشیا کے ایمبسڈر مسٹر غالب خود اپنے ہاتھ سے مہمانوں کو قرآن کا انگریزی ترجمہ پیش کررہے تھے۔

7- رمضان 1432 ہجری (اگست 2011) میں دہلی اور دہلی سے باہر کے مختلف مقامات پر مسجدوں میں ختمِ قرآن کے موقع پر لوگوں کو قرآن کا اردو اور انگریزی ترجمہ بطور ہدیہ دیا گیا۔ لوگوں نے اِس کو بہت شوق سے لیا۔ اِس سلسلے میں 21 اگست 2011 کو نظام الدین ویسٹ (D-16) کی مسجد میں ختمِ قرآن کے موقع پر مسجد کے متولی مسٹر شکیل احمد اور امام مولانا مکرم حسین قاسمی کے تعاون سے کالونی کے لوگوں کو قرآن کا ترجمہ دیا گیا۔ رمضان میں افطار پارٹی اور ختمِ قرآن کا موقع زیادہ سے زیادہ لوگوں تک قرآن پہنچانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ ہمارے مشن کے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اِس موقع کو بھرپور طور استعمال کریں۔ وہ مسجدوں میں جا کر لوگوں کو آمادہ کریں کہ وہ غیر مسلموں کے درمیان قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ پھیلائیں اور مسلمانوں کے درمیان قرآن کا اردو ترجمہ۔

8- نظام الدین ویسٹ (نئی دہلی) کے کمیونٹی سنٹر کی جانب سے اس کے ہال میں 21 اگست 2011 کو افطار پارٹی کا ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں نظام الدین ویسٹ کالونی کے ہندو اور مسلم حضرات شریک ہوئے۔ اِس موقع پر مولانا محمد ذکوان ندوی نے روزہ کی اہمیت پر ایک مختصر تقریر کی۔ یہاں گڈ ورڈ بکس کی طرف سے حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ اس کو کالونی کے لوگوں نے بہت شوق سے لیا۔

9- دہلی سے امریکا کے لیے صدر اسلامی مرکز کا ایک ٹیلی فونی خطاب 21 اگست 2011 (20 رمضان 1432 ہجری) کی شام کو ہوا۔ یہ آدھ گھنٹے کا خطاب تھا۔ اس کا موضوع تھا— Islam and Peace خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔ یہ پورا پروگرام ٹیلی کانفرنسنگ کے ذریعے امریکا کے مختلف شہروں میں سنا گیا۔ خطاب کے بعد سوال وجواب کا پروگرام ہوا۔

10- نئی دہلی کے پرگتی میدان میں 27 اگست تا 4 ستمبر 2011 کے درمیان دلی بک فیر تھا۔ اِس میں گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) نے بھی اپنا اسٹال لگایا۔ یہاں سے لوگوں نے بڑی تعداد میں اسلامی کتابیں اور دعوتی لٹریچر حاصل کیا۔

11- جموں وکشمیر کے کلاکیندر میں 9-3 ستمبر 2011 کے درمیان نیشنل بک ٹرسٹ کی طرف سے ایک بک فیر لگایا گیا۔ اِس میں گڈ ورڈ بکس (نئی دہلی) نے اپنا اسٹال لگایا۔ یہاں یہ واحد اسلامی بک اسٹال تھا۔ اِس کا انتظام گڈ ورڈ بکس کی طرف سے شاہ عمران حسن نے سنبھالا۔

12- سی پی ایس (سہارن پور) کی ٹیم کی طرف سے 28 اگست 2011 کو پیس ہال میں افطار کا ایک پروگرام ہوا۔ اِس میں مسلمانوں کے علاوہ، بڑی تعداد میں غیر مسلم حضرات نے شرکت کی۔ مثلاً سوامی دیوانند (ہری دوار)، سوامی بلدیو مہاراج (ہریانہ)، سوامی انل شاشتری (گنگوہ)، ڈاکٹر علم چند (نوئڈا)، وغیرہ۔ افطار سے پہلے ان لوگوں نے روحانیت کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ آخر میں ڈاکٹر محمد اسلم خان نے

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، روزہ اور روحانیت کے موضوع پر خطاب کیا۔ اِس موقع پر تمام حاضرین کو قرآن کے ترجمے اور دعوتی لٹریچر دیا گیا۔

13- امریکا کے لیے 4 ستمبر 2011 کی شام کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ٹیلی فونی خطاب ہوا۔ اِس کو امریکا کے مختلف شہروں میں الرسالہ مشن سے وابستہ افراد نے سنا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Spirit of Roza

آدھ گھنٹے کے اِس خطاب میں بتایا گیا کہ روزہ ترکِ طعام نہیں ہے، بلکہ وہ تقلیلِ طعام ہے۔ طعام یہاں علامتی لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے تقلیلِ حاجات، یعنی مادی ضرورتوں میں کمی کرنا، تاکہ ذہنی اور روحانی ارتقا کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔

14- ورلڈ اسپریچول پارلیامنٹ (نئی دہلی) کے تحت 5 ستمبر 2011 کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) کے آڈی ٹوریم میں ایک سیمنار ہوا۔ اِس میں سی پی ایس کی ایک ممبر مزعائشہ کو اسپریچول ٹیچر کا نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ اِس موقع پر سی پی ایس کی طرف سے حاضرین کو قرآن کا انگریزی ترجمہ اور دعوتی میٹریل دیا گیا۔

15- سی پی ایس انٹرنیشنل (نئی دہلی) کے تحت 5 ستمبر 2011 کی شام کو C-29 نظام الدین ویسٹ (نئی دہلی) میں ایک خصوصی تربیتی پروگرام ہوا۔ اِس میں دہلی کے علاوہ، سی پی ایس (بنگلور) کی ٹیم کے ممبران بھی موجود تھے۔ اِس موقع پر صدر اسلامی مرکز نے دعوت الی اللہ کی اہمیت کے موضوع پر 45 منٹ کی ایک تقریر کی۔ اِس تقریر میں ایک بات یہ کہی گئی کہ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ صدر اسلامی مرکز کے بعد کون سی پی ایس کے دعوتی کام کے تسلسل کو جاری رکھے گا۔ اِس کی وضاحت کرتے ہوئے صدر اسلامی مرکز نے بتایا کہ سی پی ایس اور الرسالہ مشن کی پشت پر ایک طاقت ور لٹریچر موجود ہے۔ میرے بعد ان شاء اللہ یہی دعوتی لٹریچر میری نمائندگی کرے گا۔ خطاب کے بعد مغرب کی نماز ادا کی گئی۔ نماز کے بعد ساتھیوں نے باہم مشورہ کیا۔ اس کے بعد عشا کی نماز باجماعت پر پروگرام ختم ہوا۔

16- کمیونٹی آف سینٹ ایجی ڈیو ایک مسیحی تنظیم ہے۔ اس کا صدر دفتر روم (اٹلی) میں ہے۔ اس کے تحت میونک (جرمنی) میں 13-11 ستمبر 2011 کو ایک انٹرنیشنل سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Bound to Live Together: Religions and Cultures in Dialogue

صدر اسلامی مرکز کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ 6 آدمی کے سفر کے انتظامات ہو چکے تھے، لیکن بعض وجوہ سے یہ سفر ممکن نہ ہو سکا۔ منتظمین کی فرمائش کے مطابق، موضوع سے متعلق ایک پیپر بذریعہ ای میل ان کو بھیج دیا گیا۔

17- پنجاب ہوٹل (سہارن پور) میں 16 ستمبر 2011 کو سی پی ایس سہارن پور کی طرف سے ہوٹل میں ٹھہرنے والے تمام لوگوں کو قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ دیا گیا۔ ہوٹل کے منیجر مسٹر روندر داس گپتا نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ اِس سے لوگوں کے اندر پازیٹو تھنکنگ پیدا ہوگی اور ان کی سوچ بدلے گی۔

18- امریکا کے لیے 19 ستمبر 2011 کی شام کو صدر اسلامی مرکز کا ایک ٹیلی فونی خطاب ہوا۔ اِس کو امریکا کے

مختلف شہروں میں الرسالہ مشن سے وابستہ افراد نے سنا۔ اس کا موضوع یہ تھا:

Role of Islam in Building a Peaceful Personality

19- استنبول (ترکی) میں آنے والے غیر مسلم ٹورسٹس (tourists) کو گڈورڈ بکس (نئی دہلی) اور امام اسماعیل کرا کیلے (امام مسجد رستم پاشا، استنبول) کے تعاون سے بڑے پیمانے پر قرآن کا انگریزی ترجمہ دیا جارہا ہے۔ آنے والے زائرین اِس کو بہت شوق سے قبول کرتے ہیں۔ جو لوگ اس دعوتی کام میں حصہ لینا چاہتے ہیں، وہ براہِ کرم مولانا محمد ذکوان ندوی سے رابطہ قائم کریں: 098994 30625

20- سی پی ایس انٹرنیشنل (نئی دہلی) کی ٹیم کے ذریعے دہلی اور اطراف دہلی میں دعوت کا کام جاری ہے۔ ستمبر 2011 کے پہلے ہفتے سے ٹیم کے لوگوں نے مسٹر خرم قریشی (پائلٹ ائرانڈیا) کے ساتھ مل کر منظّم طور پر عمومی دعوت کا کام شروع کیا ہے۔ ہر ہفتے یہ لوگ کسی مخصوص اجتماعی مقام مثلاً مال (شاپنگ سنٹر)، وغیرہ پر جاتے ہیں اور وہاں لوگوں سے انٹریکشن کے دوران ان کو مطالعے کے لیے دعوتی مٹیریل، خاص طور پر، Creation Plan of God، Reality of Life اور قرآن کا ہندی اور انگریزی ترجمہ دیتے ہیں۔

21- ٹائمس آف انڈیا (نئی دہلی) اور انگریزی کے دیگر اخبار اور میگزین میں مسلسل صدر اسلامی مرکز کے مضامین شائع ہورہے ہیں۔ یہ تمام مضامین سی پی ایس انٹرنیشنل کے ویب سائٹ (www.cpsglobal.org) پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہاں ٹائمس آف انڈیا (24 مئی 2011) میں صدر اسلامی مرکز کے شائع شدہ مضمون (Depression As Blessing) پر قارئین کے چند تاثرات نقل کئے جاتے ہیں:

- This is something that has motivated me, also after eons! (Diwakar Sharma)
- Thank you so much for publishing this article. I read it in the TOI. It has been really helpful in giving me a ray of hope in life. (Soujy Sharma)
- It is very nice. The positive aspect of depression was completely unknown to me. (Soumyadip Roy)
- Clearly a beautiful perception: that depression can be used as a tool for going towards success. (Arvind Selvam)
- This article has been very inspiring, especially for me, because I was going through a dark time in my mind. The thoughts here are well explained, rational and have a lot of clarity. (Swaha Pattanaik)
- Thanks for such a great article. It gives a new dimension to depression. It will certainly help a person cope better with depression. (Sachin Jain)

- This is certainly an informative write-up, I must say! You have made it clear that the concept of depression should be regarded as a part of success. The unpleasant memories and discontentment do play their part in making one stronger in his decisions; as told, failures are nothing but just mere steps to success. This article is informative and encouraging. (Suhasini Srihari)
- This article is very clear and very informative for everyone. Persons who are going through a depressed state of mind can learn what to do through this article and how to overcome it. After reading this article they will get mental peace. The writer says that a person can develop better decision making during a depressed state.
(Nitesh Bhadauria)

22- قرآن کے انگریزی ترجمہ اور دعوتی لٹریچر کے متعلق قارئین کے چند تاثرات ملاحظہ ہوں:

- It is the need of the hour to understand the law of the nature & settle for the second best in order to make life peaceful & joyful. During such a period where every one is preaching fundamentalism, it is always surprising for me to hear such a moderate & liberal thought of an Islamic scholar. (A.M.P.Sinha, Roorki, Uttara Khand)
- I am living in Canada for the last 10 years. Few years back during a visit to Pakistan, I purchase lot of your books and many year wise compilation of Alrisala. I read all those books and Alrisala of the past many years. Your literature has changed my life. The "sabr" and "e'raaz" has save me from so many big loses that I can imagine. Once I got a chance to have a meeting with a high Canadian official, he was much worried about the Muslim fundamentalist and approach of the entire Muslim world. He asked me about my suggestions I told him that I have only one solution is that Maulana Wahiduddin Khan's literature may be translated and distributed on large scale both in the Muslim and none Muslim world. Its result will especially will be having great positive effects on the Muslim world. (Jan Muhammad, Vancouver, Canada)
- Just read some verses in the beginning of Al-Baqarah in PDF format, I felt enlightened with the translation and commentary by Maulana Wahidudin Khan. I will very happy if you would like to send me more

than 1 copy, so I will be able to share the Quran with some enthusiast young Muslims, individuals or educational institution, in studying Quran, here in Indonesia. (Rahmad Saleh, Jawa Tengah, Indonesia)

- I very much appreciate the books by Maulana Wahiduddin Khan that you gave me. They look very good and will be important additions to the collection of books we are gathering in our Center for Interfaith Engagement. Thank you for introducing me to the work and vision of Maulana Wahiduddin Khan. (Ed Martin, Director Center for Interfaith Engagement, Eastern Mennonite University Harrisonburg, Virginia, USA)
- I have received the books from you. I am out of words - but all I can say is that May Allah bless you with vast rewards with every letter read in every page of every book as long as the books survive and beyond that! Other than that, I do not know what to say to such people like you, people of Janna. (Maggie Amin, Islamic Library, Toronto)
- To date thanks to Goodword, we have distributed the English Qurans to prisons, to non muslims , and intellectuals and the list goes on. I have many response how this unique publications has benefited the person who came in contact with the Quran.Through our purchased stocks from you we sold thousands of copies through our bookstore at CII Stores. (Ashraf Ali Seedaat, Johannesburg, S. Africa)
- Dr Gurcharan Singh (Banglore), after going through the pages of "The Reality of Life", said with moist eyes "Nobody, except one who has experienced highest level of spirituality can express in such a way. This is a great contribution to spirituality. (Dr. Syed Shad Husain, Kashmir)

ہریانہ، پنجاب، ہماچل پردیش، یوپی اور اتراکھنڈ کے قارئینِ الرسالہ اپنا خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر بھیج کر دعوتی مقصد کے لیے اردو، ہندی اور انگریزی ترجمہ قرآن مفت حاصل کر سکتے ہیں:

Dr. Mohd Aslam Khan
Ayodhya Puram, Mahipura, Dehradun Road
Saharanpur-247001, U.P.
Mobile: 07417629982, 09997153735

ایجنسی الرسالہ

الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ الرسالہ (اردو) کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ الرسالہ (انگریزی) کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہنچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہنچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملّت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

1- الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن 25 فی صد ہے۔ 100 پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن 33 فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔

2- زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔

3- کم تعداد والی ایجنسی کے لئے ادائیگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحبِ ایجنسی ہر ماہ یا دو تین ماہ بعد اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کردے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینے میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

Rahnuma-e-Hayat
by
Maulana Wahiduddin Khan
ETV Urdu
Monday, Tuesday, Wednesday,
Thursday 6.30 am

Islami Zindagi/Questions and Answers
by
Maulana Wahiduddin Khan
Zee Salaam
Daily 6.00 am, 6.30 pm

ISLAM FOR KIDS
by
Saniyasnain Khan/Maria Khan
ETV Urdu
Sunday 9.00 am

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

اللہ اکبر
اتحادِ ملت
احیاءِ اسلام
اسبابِ تاریخ
اسفارِ ہند
اسلام: ایک تعارف
اسلام: ایک عظیم جدوجہد
اسلام اور عصرِ حاضر
اسلام پندرہویں صدی میں
اسلام دورِ جدید کا خالق
اسلام دینِ فطرت
اسلام کا تعارف
اسلام کیا ہے
اسلامی تعلیمات
اسلامی دعوت
اسلامی زندگی
اقوالِ حکمت
الاسلام
الربانیۃ
امنِ عالم
امہات المومنین
انسان اپنے آپ کو پہچان
انسان کی منزل
ایمانی طاقت
آخری سفر
باغِ جنت
پیغمبرِ اسلام
پیغمبرِ انقلاب
تذکیر القرآن
تاریخ دعوتِ حق
تاریخ کا سبق
تبلیغی تحریک
تجدید دین
تذکیۂ نفس
تصویرِ ملت
تعارفِ اسلام
تعبیر کی غلطی
تعددِ ازواج
تعمیرِ انسانیت

تعمیرِ حیات
تعمیر کی طرف
تعمیرِ ملت
حدیثِ رسول
حکمتِ اسلام
حقیقتِ حج
حقیقت کی تلاش
حل یہاں ہے
حیاتِ طیبہ
خاتونِ اسلام
خدا اور انسان
خلیج ڈائری
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
دینِ انسانیت
دینِ کامل
دین کی سیاسی تعبیر
دین کیا ہے
دینِ وشریعت
دینی تعلیم
ڈائری 84-1983
ڈائری 90-1989
ڈائری 92-1991
ڈائری 94-1993
رازِ حیات
راہِ عمل
راہیں بند نہیں
روشن مستقبل
رہنمائے حیات (کتابچہ)
رہنمائے حیات
زلزلہ قیامت
سبق آموز واقعات
سچا راستہ
سفرنامہ اسپین و فلسطین
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد اول)
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار، جلد دوم)
سوشلزم اور اسلام
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
سیرتِ رسول

شتمِ رسول کا مسئلہ
صراطِ مستقیم
صوم رمضان
طلاق اسلام میں
ظہورِ اسلام
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
عظمتِ قرآن
عظمتِ مومن
عقلیاتِ اسلام
علما اور دورِ جدید
عورت معمارِ انسانیت
فسادات کا مسئلہ
فکرِ اسلامی
کامیاب ازدواجی زندگی
قال اللہ وقال الرسول
قرآن کا مطلوب انسان
قیادت نامہ
قیامت کا الارم
کاروانِ ملت
کتابِ زندگی
کشمیر میں امن
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
مذہب اور جدید چیلنج
مذہب اور سائنس
مسائلِ اجتہاد
مضامین اسلام
مطالعۂ حدیث
مطالعۂ سیرت (کتابچہ)
مطالعۂ سیرت
مطالعۂ قرآن
منزل کی طرف
مولانا مودودی شخصیت اور تحریک
میوات کا سفر
نارِ جہنم
نشری تقریریں
ہندستان آزادی کے بعد
ہندستانی مسلمان
ہند-پاک ڈائری
یکساں سول کوڈ